

# علمِ حدیث پر احکم محمدین

سالم قدوائی

[toobaa-elibrary.blogspot.com](http://toobaa-elibrary.blogspot.com)

6853  
3-5-83



ندیر سنرپبلشرز

۳۰ اے اردو بازار لاہور

# فہرست

۵	مقدمہ
۱۳	۱۔ تاریخ تدوین حدیث
۳۷	۲۔ اصول حدیث
۴۹	۳۔ اصطلاحات حدیث
۵۵	۴۔ امام البخاریؒ
۷۰	۵۔ امام مالکؒ
۹۱	۶۔ امام شافعیؒ
۱۰۰	۷۔ امام احمد بن حنبلؒ
۱۱۵	۸۔ امام بخاریؒ
۱۱۳	۹۔ امام مسلمؒ
۱۳۷	۱۰۔ امام ابو داؤدؒ
۱۵۹	۱۱۔ امام ترمذیؒ
۱۷۳	۱۲۔ امام نسائیؒ
۱۸۴	۱۳۔ امام ابن ماجہؒ
۱۹۴	کتابیات

قیمت ۱۱۰/- روپے  
جولائی ۱۹۸۲ء  
زاد شیر پور لاہور  
بار اول  
مطبع

نذیر حسین  
نذیر سپینز  
پیشتر

## مقدمہ

دین و شریعت سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جو کچھ منسوب ہو اس کو "حدیث" کہتے ہیں۔ حدیث کا سرچشمہ شہور نبوت ہے جس کی رسائی کا اندازہ دعوت اسلام کے سب سے پہلے حیات بخش خطاب سے ہوتا ہے۔ آپ نے قریش کو جمع کر کے صفا پہاڑی کی چوٹی پر کھڑے ہو کر فرمایا:

"اے قریش کے لوگو! تم مجھے بتاؤ اگر میں یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے دامن سے ایک فوج نکل کر تم پر حملہ کرنے والی ہے تو میری تصدیق کرو گے؟ سب نے بیک زبان ہو کر کہا ہے شک۔ ہم نے بھی آپ سے سوائے حق کے اور تجربہ نہیں کیا۔"

جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صفا کی چوٹی پر کھڑے پہاڑ کی دونوں سمتوں کو دیکھ رہے تھے اسی طرح حقیقت کے کئی ادراک کے بعد شہور نبوت بہت سی ان باتوں کو دیکھتا اور ان اشارات کو پاتا رہتا ہے جن تک رسائی دوسروں کی نہیں ہو سکتی۔ خود رسول اللہ نے اس "رسائی" کو کئی مرتبہ ان الفاظ میں ظاہر فرمایا: "انی ارسى مالا ترون" (میں وہ دیکھتا ہوں

بہتر نہیں دیکھتے ہو)

شورِ نبوت نے حدیث کو قرآن حکیم کی معنوی دلالت سے حاصل کیا، جس کا طریقہ یہ تھا کہ آپ پر جب آیتیں نازل ہوتیں تو ان کی معنوی دلالت پر غور و فکر کر کے تشریح، تفصیل اور توضیح کا خاکہ تیار کرتے پھر اس کے مطابق ہدایات و تعلیمات کا سلسلہ جاری رہتا یہ دونوں بھی قرآنی ہوتیں اور کبھی قرآنی و عملی دونوں ہوتی تھیں۔

قرآن حکیم دراصل مقاصد، مصالح اور اصول و کلیات ہی کی کتاب ہے اس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق جس قدر جزئیات ہیں وہ بطور نمونہ انہیں کی تشریح تفصیل اور توضیح کے لیے ہیں تاکہ ان کی روشنی میں نمونہ زندگی اور ترقی پذیر معاشرہ کی رہنمائی کے لیے اخذ و استنباط کا سلسلہ جاری رہے اس اخذ و استنباط کے سب سے پہلے مخاطب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے پھر آپ کے بعد تمام وہ لوگ مخاطب ہیں جو اخذ و استنباط کی صلاحیت رکھتے ہیں رسول اللہ نے شورِ نبوت کے ذریعہ اس فریضہ کو انجام دیا اور بعد کے لوگ شورِ اجتہاد کے ذریعہ اس فریضہ کو انجام دیتے پر مامور ہیں۔

ختمِ نبوت پر شورِ نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا، لیکن یہ اس وقت ختم ہوا جبکہ شورِ اجتہاد اس کی قائم مقامی کے قابل بن گیا یعنی اس میں اس درجہ تک توانائی اور خود اعتمادی پیدا ہو گئی کہ زندگی و معاشرہ کے مسائل حل کرنے کے لیے بار بار آسمان کی طرف نظر اٹھانے کی ضرورت نہ رہ گئی (جیسا کہ ختمِ نبوت سے پہلے رسول اور نبی کے ذریعے آسمانی ہدایت کا انتظار رہتا تھا) بلکہ وہ خود غور و فکر اور تماشہ و جستجو سے یہ مسائل حل کرنے لگا۔

لیکن زندگی و معاشرہ کا تجربہ رکھنے والے ماہرین و مفکرین اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ شورِ اجتہاد کے فیصلے طبعی خصوصیات و بشری کمزوریوں سے خالص دیے آئیں نہیں ہوتے ہیں اس بنا پر اس کو آزاد و خود مختار نہیں چھوڑا گیا بلکہ ہر مؤثر و ہر مؤقت پر شورِ نبوت کی رہنمائی کو ضروری قرار دیا گیا۔

اس شور سے رہنمائی حاصل کرنے کا براہ راست سلسلہ اگرچہ ختم ہو گیا لیکن اس سے حاصل شدہ سرمایہ حدیث کے نام سے موجود و محفوظ ہے اس سرمایے کے جمع و تدوین میں محدثین نے جس قدر کوششیں اور کادوشیں کی ہیں اس کا اندازہ گولڈن زیہر جیسے شصت مصنف کے اعران سے ہوتا ہے اس نے لکھا ہے:

"حدیثوں کو جمع کرنے کے لیے محدثین نے اسلامی دنیا کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک، اندلس سے وسط ایشیا تک شہر شہر اور گاؤں گاؤں کا پیدل سفر کیا تاکہ وہ دوسروں تک منتقل کر سکیں اس زمانے میں جمع کرنے کی اس سے زیادہ معتبر اور قابل اعتماد صورت نہ تھی۔ رجال (بہت سفر کرنے والے) اور رجال (بہت سیر و سیاحت کرنے والے) کے قابلِ خزانہ دراصل ان اونچے درجے کے لوگوں سے کبھی جدا نہیں ہوئے۔ راہِ علم کے ان مسافروں کے لیے طوائف الاقالیم (ملکوں کا طواف کرنے والے) نہ کسی اعتبار پر مبنی ہے اور نہ اس میں کسی طرح کا مبالغہ ہے۔ ان لوگوں نے ان تمام ملکوں کا سفر محض سیر و سیاحت یا تجربہ حاصل

ذہنی سطح سے بلند تھا اگرچہ بعد میں اس کا رواج ہو گیا ہو وغیرہ، حالانکہ رسول اللہ کا صاحب دجی تھے اسرار غیبی سے بھی ایک حد تک واقف تھے علم وحکمت کی ترویج اور قانون و شریعت کا نفاذ آپ کا خاص مشن تھا اس لیے آپ نے اگر کوئی بات وقت کی ذہنی سطح سے بلند فرمائی یا قانون و اصول اس انداز سے بیان کیے کہ بعد میں فلسفہ یا قانونی کلیہ کے مشابہ قرار پائے تو نہ شان نبوت پر حرف آتا ہے اور نہ کسی عقن و فلسفی سے متاثر ہونے کا سوال اٹھتا ہے۔

✓ نقد و تحقیق کے سلسلے میں یہ بات ضرور یاد رکھنی چاہیے کہ حدیث کا سرچشمہ شور نبوت ہے اس کو جو خصوصیات اور تحفظات حاصل ہیں وہ کسی اور کے شعور کو حاصل نہیں ہیں۔ لازمی طور سے شور نبوت سے منجلی ہوئی بات (حدیث) عام لوگوں سے ممتاز اور اس کی نقد و تحقیق کا معیار دوسروں کے معیار سے مختلف ہوگا، ورنہ نبی اور غیر نبی کے کلام میں فرق و امتیاز نہ قائم رہے گا۔

حدیث اور محدثین کو سمجھنے کے لیے زیر نظر کتاب نہایت اہم ہے اس میں تاریخ تدوین حدیث، اصول حدیث، اصطلاحات حدیث اور اہم محدثین کے حالات پر مجلس زبان میں عام فہم گفتگو کی گئی ہے اور محدثین کی فنی احتیاط اور دیانت داری کو مختلف واقعات کے تحت واضح کر دیا ہے مثلاً امام بخاری کے شیخ علی بن مدینی سے ان کے والد کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے جواب دیا "دین کا معاطہ ہے، میرے والد ضعیف راوی ہیں" امام دیکھ کے والد سرکاری عزائم کے ذمے دار تھے اس لیے امام دیکھ کر ان کی کسی ایسی روایت کو نہ تسلیم کرتے تھے جو صرف ان سے مروی

کرنے کے لیے نہیں کیا تھا بلکہ ان کا مقصد صرف حدیث کے جاننے والوں سے ملنا اور ان سے حدیثیں حاصل کرنا تھا حدیث کی طلب و جستجو میں ان کی مثال اس چڑیا کی تھی جو ہر درخت (اس کی ہر شاخ) پر اس کی پتیوں سے غذا حاصل کرنے اور لطف اندوز ہونے کے لیے بیٹھتی ہے۔

✓ جمع و تدوین کے علاوہ حدیث کی صحیح معرفت کے لیے بھی محدثین نے تحقیق و تنقید کا ایک معیار مقرر کیا ہے جس کے بعد اس کی معرفت میں کوئی دشواری نہیں رہتی۔ یہ معیار سند اور متن دونوں سے متعلق ہے متن اصل حدیث اور سند اس تک پہنچنے کے ذریعے اور راستے کو کہتے ہیں۔ سند کو جاننے کا تعلق خارجی نقد حدیث اور متن کے جانچنے کا تعلق داخلی نقد حدیث سے ہے۔ ہر ایک کے اصول و مضابط اور قواعد و قوانین اصول حدیث کی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ موجود ہیں۔

✓ حدیث کی معرفت میں دشواری اس لیے پیش آتی ہے کہ کلام نبوت (حدیث) کو اسی معیار سے جانچنے کی کوشش ہوتی ہے جو معیار عام لوگوں کے کلام کو جانچنے کے لیے ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر ایسی حدیث کا انکار کر دیا جاتا ہے جس میں کوئی علمی حقیقت بیان ہوئی تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں وہ مشہور نہ تھی یا کوئی حدیث جو خبر غیری سے متعلق تھی جس کا بھی وقت نہ آیا تھا، یا قانونی کلیہ یا حکمت کا اصول بیان ہوا تھا جو اس وقت کی

جو۔ امام ابو داؤد نے اپنے بیٹے کے بارے میں فرمایا کہ وہ کذاب ہے۔ امام  
ماہک کا بیان ہے کہ مدینہ میں ایسے لوگ تھے کہ اگر بارش کی دعا کرتے تو  
ان کی دعا کی برکت سے بارش ہوتی لیکن میں نے ان سے استفادہ نہیں کیا  
اس لیے کہ یہ لوگ زہد و تقویٰ میں تو بے مثال تھے لیکن حدیث و روایت اور  
فتوؤں کا کام غرض زہد و تقویٰ سے نہیں چل سکتا اس کے لیے علم و فہم کی بھی  
ضرورت ہوتی ہے جس زہد کے ساتھ فہم و فراست اور دانائی نہ ہو وہ علم و  
فن کے لیے مفید نہیں ہے اس قسم کے واقعات ان لوگوں کی آنکھیں کھولنے  
کے لیے کافی ہیں جو ہر معاملے میں کسی ایک فرد کی بات کو حجت تسلیم کرتے  
ہیں اور اس کے مقابلے میں کوئی کتنا ہی بڑا حقیق عالم ہو کوئی اہمیت نہیں  
دیتے ہیں۔ اب علم و تحقیق کی دنیا بڑی وسیع ہو گئی ہے پہلے ایک فرد کی  
صلاحیت کافی ہوتی تھی اب تقسیم کار کے بغیر چارہ نہیں رہ گیا ہے۔ پہلے  
رہنمائی کی ضرورت ایک معاشرے تک محدود تھی اب اس کا تعلق ایک دور  
اور زمانے سے ہو گیا ہے ایسی حالت میں جس طرح کسی ایک فرد سے اپنی  
تمام ضرورتوں کو وابستہ کرنا ناقابل اندیشی ہے اسی طرح کسی فرد کا  
زندگی کے ہر گوشے میں رہنمائی کا عمل بننا خود فریبی ہے۔

ڈاکٹر محمد سالم قدوائی صاحب کے مضامین علمی رسالوں 'معارف'  
برہان' اسلام اور عصر جدید، جملہ علوم اسلامیہ اور رسالہ جامعہ میں شائع  
ہوتے رہے ہیں جن سے اہل علم متعارف ہیں۔ ان کی کتاب ہندوستانی  
مفسرین اور ان کی عربی تفسیریں، کبھی شائع ہو چکی ہے جس پر انھیں  
ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی ہے۔ یہ کتاب بھی انھوں نے بڑی محنت اور  
تلاش و جستجو کے بعد مرتب کی ہے اور بڑی بات یہ ہے کہ یہ حصے سے

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں درس و تدریس کے فرائض  
انجام دے رہے ہیں اس بناء پر جدید ذہن اور انجام فہم کے طریقوں سے  
بخوبی واقف ہیں۔ یہ کتاب اصلاً دینیات یا اسلامیات اسٹڈیز کے ان طلبہ  
کے لیے لکھی گئی ہے جن کے کورس میں حدیث اور محدثین سے متعلق مضامین مل  
ہیں اسی بناء پر بعض فنی تفصیلات سے قصداً گریز کیا ہے اور اصطلاحات  
کو نہایت سلیس اور عام فہم زبان میں پیش کیا گیا ہے۔ ایک مدت سے میری  
خواہش تھی کہ یونیورسٹی کے طلبہ کے ذہن کے مطابق ان کے کورس کے مضامین  
پر مشتمل کتابیں مرتب کی جائیں لیکن یہ خواہش پوری نہ ہو سکی اب یہ کتاب کچھ  
گردافتی بے حدسرت ہوئی اور مؤلف ملے کے لیے دل سے دعائیں نکلیں ضرورت  
ہے کہ اسی طرز پر کورس کے اور مضامین پر بھی کتابیں مرتب کی جائیں۔ اللہ  
مؤلف کو جزائے خیر عطا فرمائے اور کتاب کو شرف قبولیت بخشے۔ آمین

محمد تقی امینی

ناظم دینیات

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

## تایخ تدوین حدیث

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر  
انسانوں کی رہنمائی اور اصلاح کے لیے نازل کیا گیا۔ چونکہ یہ ایک مجموعہ قوانین  
و احکام ہے اور اس سے رہتی دنیا تک لوگوں کو اپنے مسائل کے حل اور  
نظام زندگی و معیشت و حکمرانی کے اصول و ضوابط مرتب کرنے ہیں اس لیے  
اس میں اللہ تعالیٰ نے مختصر انداز میں اس وقت اور آئندہ پیش آنے والے  
تمام حالات اور مواقع کے بنیادی اصول بیان کر دیے۔ اسی کے ساتھ  
ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ ذمے داری ڈالی کہ وہ ان باتوں کو لوگوں کو  
بکھائیں اور اپنے حل سے ذہن نشین کرائیں تاکہ آئندہ لوگوں کے لیے یہ  
نمونہ بن جائے اور جس بات میں لوگوں کو کچھ سمجھنے میں دقت ہو وہ آپ کے  
اقوال و افعال کی روشنی میں اسے سمجھ سکیں۔ آپ کے انہی اقوال و افعال کو  
حدیث کہتے ہیں۔

حدیث کے لغوی معنی بات چیت کے ہیں، لیکن بعد میں اصطلاح میں یہ  
لفظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال اور ایسے واقعات جو

آپ کے سامنے پیش آئے اور آپ نے ان میں کوئی تبدیلی نہیں کی (جسے اصطلاحاً تقریر کہتے ہیں) کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ بعض لوگوں نے حدیث کے مفہوم کو بہانہ سمجھ کر وہ امور جن کا تعلق کسی بھی طرح حضور سے اور حضور کے زمانے سے ہو۔ گویا حدیث ایک طرح سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کی تاریخ کا نام ہے۔

حدیث کی تین قسمیں ہیں:-

(۱) قولی: یعنی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا ہو۔

(۲) فعلی: یعنی جو آپ نے کیا ہو۔

(۳) تقریری: یعنی جو بات آپ کے سامنے کی گئی اور آپ نے اس سے رد کیا نہیں۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے لکھا ہے:

"آپ کے یہ اقوال و افعال اور آپ کا یہ سکوت ہمارے لیے مشعل راہ ہیں جن کی روشنی میں اگر ہم خالق پاک کی خوشنودی حاصل کرنے کا راستہ لے کر ناجائز تو شرعی موقوفہ تک پہنچنے میں کچھ بھی شک باقی نہیں رہ جاتا۔ اس راستے پر چلنے والے کے لیے صراطِ مستقیم سے بھٹک جانے کا کوئی خطرہ نہیں جس نے آنحضرت کی حدیث پر عمل کیا وہ راہِ یاب ہوا اور جس نے اس سے منہ پھیرا وہ یقیناً گمراہ ہے اس پر عمل کرنے میں خیر کثیر ہے اور اس پر عمل نہ کرنا خسارِ بین ہے۔" ۱۷

✓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اقوال و افعال مسلمانوں کے لیے اسی طرح سے دستورِ عمل ہیں جس طرح سے کہ قرآن مجید۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی اپنی سنت پر عمل کرنے کی تلقین کی ہے، اور فرمایا ہے: "ترکات فیکم انقلبت کتاب اللہ و سنتی" (میں نے تمہارے پاس دو اہم چیزیں چھوڑی ہیں ایک تو اللہ کی کتاب اور دوسری اپنی سنت) اور "علیکم سنتی من رقبہ عن سنتی فلیس منی" (تمہارے اوپر میری سنت لازم ہے اور جس میری سنت سے انحراف کیا وہ مجھ سے نہیں ہے)۔ آج تو یہ ہے کہ قرآن مجید کو سمجھنے کے لیے حدیث کی واقفیت بہت ضروری ہے، حدیث قرآن مجید کی تشریح و توضیح ہے اور قرآن و حدیث مل کر اسلام کی حکمرانی کی بنیادیں ہیں۔ حدیث ایک طرف قرآن کریم کی تفسیر ہے، اس کے اجمال کی تفصیل ہے، اس کے احکامات کی تشریح ہے اور اسلام کے ابتدائی دور کی سب سے اہم اور سب سے معتبر تاریخ بھی۔ اگر حدیث کا سرمایہ محفوظ نہ رہا ہوتا تو اسلام کی تعلیمات اور اس کی تاریخ کے ایک بہت بڑے حصے کو سمجھنے سے بعد کے لوگ قاصر رہتے۔ مثلاً قرآن مجید میں نماز روزہ حج زکوٰۃ وغیرہ کے اصولوں کا ذکر ہے اس کی تفصیل ہمیں صرف احادیث ہی کے ذریعے سے معلوم ہو سکتی ہے۔ حکومت کے نظام، سماج کے ضابطہ، حلال و حرام کے قواعد اور ادوار و نواہی کا پورا پورا پتہ صرف حدیث ہی سے چلتا ہے۔ رسول اللہ کی ابتدائی زندگی اسلام کی آمد اس کی تبلیغ، مسلمانوں کی اس راہ میں قربانیاں اعلیٰ کلمۃ حق کا جذبہ اور اس سلسلے میں کوششیں، غزوات اسلام کا پھیلنا اور اس کا اثر و رسوخ، اسلامی حکومت کا قیام اور اس کا نظام اور خود حضور کی سیرت مقدسہ کے معلوم کرنے کا سب سے



نمودہ ہے" (احزاب - ۳)

رسول اللہ کی اطاعت کا حکم دیا گیا:

"اور اللہ اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم

کجا جائے" (آل عمران - ۱۷۲)

دوسری جگہ ہے:

"آپ کہہ دیجیے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری

پروی کرو اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہوں کو

معاف کر دے گا۔" (آل عمران - ۷۷)

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت

کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی"

ایک اور جگہ کہا:

"میں جس چیز سے تم کو منع کروں اس سے رک جاؤ اور

جس چیز کا حکم دوں اس کو اختیار کرو"

✓ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اقوال و افعال کی اہمیت کو

سمجھتے تھے اور آپ کو یقین تھا کہ یہ باتیں اور یہ افعال بعد میں آنے والی نسلوں

کے لیے بہت کام کے ہوں گے، اسی لیے آپ نے متعدد بار اپنے اصحاب کو حکم دیا

تھا کہ اس قیمتی سرمائے کو محفوظ کر لیں اور نہ صرف یہ کہ محفوظ کریں بلکہ یہ دے

داری بھی عائد کی کہ جو لوگ میں وہ دوسروں تک پہنچا بھی دیں۔ حجتہ الوداع

کے خطبے میں آپ کا یہ جملہ: **فلیبلغ الشاهد الغائب** (جو لوگ موجود

ہیں وہ اُن لوگوں تک ان باتوں کو پہنچا دیں جو موجود نہیں ہیں) اس کا سب

اہم اور قابل اعتماد تاخذ یہ حدیثیں ہی ہیں۔ اگر ان کو بوری احتیاط اپنا لاری

اور سمجھ بوجھ کے ساتھ محفوظ نہ رکھا گیا ہوتا تو شاید یہ یقیناً اسلام کی بہت

سی تعلیمات اور اسلامی تاریخ کے بے شمار گوشے آج لوگوں کے سامنے

نہ ہوتے۔

قرآن مجید کی بہت سی آیتوں سے بھی اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ رسول

صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل کو سامنے رکھنا اور اس کے مطابق عمل کرنا

مسلمانوں کے لیے ضروری ہے، جگہ جگہ رسول اللہ کو حکم دیا گیا کہ آیات قرآنی

کی تشریح و توضیح کریں:

"ہم نے تم پر کتاب اس لیے اتاری ہے کہ تم ان کے لیے

ان چیزوں کی وضاحت کرو جس میں انہوں نے اختلاف کیا

اور اس کو ان لوگوں کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں ہدایت اور

رحمت بنا کر اتارا" (سورہ نحل - ۸)

ایک اور جگہ پر ہے:

"اور ہم نے تمہاری طرف حق کے ساتھ کتاب اتاری

تاکہ تم لوگوں کے درمیان جس طرح خدا نے تجھایا ہے اس طرح

فیصلہ کرو" (سورہ نساء - ۱۶)

رسول اللہ کی گفتگو کو من جانب اللہ قرار دیا:

"رسول اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتا بلکہ وہ وحی ہوتی

ہے جو اس کو کی جاتی ہے" (بخاری - ۱)

رسول اللہ کی زندگی کو نمونہ بنایا گیا ہے:

"لوگو، تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر اچھا

سے بڑا ثبوت ہے۔

اس کے علاوہ بھی احفظوہ و اخبروہ من در اشکمہ (ان باتوں کو یاد کرو اور جو لوگ پیچھے رہ گئے ہیں ان کو مطلع کرو) یا "ارجعوا الی اھلبکم فعلوہم" (اپنے گھروالوں کے پاس واپس جاؤ اور ان کو سکھاؤ) — اس قسم کی بہت سی احادیث موجود ہیں۔

اسلام کے ابتدائی دور ہی سے جو لوگ مسلمان ہوتے تھے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے غیر معمولی محبت اور مذہب سے بے حد تعلق محسوس کرتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ دنیاوی عیش و عشرت کے سامان کے منافع میں ان کو اللہ سے تعلق اور رسولؐ سے قرب زیادہ محبوب تھا۔ ایک مرتبہ کلہ توحید پڑھنے کے بعد وہ اپنے آپ کو ایک دوسری ہی دنیا اور ایک نئے عالم میں پاتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ وہ اس سے الگ ہونے کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ یہ لوگ حضورؐ کی محبت اور جذبہ عقیدت سے اس قدر سرشار ہوتے تھے کہ آپؐ کی ایک ایک بات کو بغور دیکھتے اور سنتے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتے۔ ان لوگوں کی تمنا ہوتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ وقت آپؐ کے ساتھ گزاریں اور آپؐ کی تعلیمات کو یاد رکھیں۔ جوں جوں اسلام کا حلقہ بڑھتا گیا۔ آپؐ کی تعلیمات کا دائرہ بھی وسیع ہوتا گیا۔ جہاں چند لوگوں کو صرف چند مسائل درپیش ہوتے تھے وہاں سیکڑوں ہزاروں لوگوں کے مسائل اسی مناسبت سے بڑھ گئے اور احادیث کا سلسلہ بھی پھیلتا گیا۔ آپؐ کے صحابہ ہر اس بات کو اسی طرح سے کرنے کی کوشش کرتے جس طرح سے آپؐ فرماتے یا عمل کرتے اور ان کی یہ تمنا ہوتی تھی کہ وہ ایمان و یقین اور علم و عمل کے اسی رنگ میں رنگ جائیں جو اللہ اور رسولؐ کو مرغوب تھا۔ اس طرح سے بہت سے صحابہ

رسول اللہؐ کی زندگی کا عملی نمونہ بن گئے تھے اور یہ تدوین حدیث کی پہلی شکل تھی جو پوری طرح سے محفوظ اور قابل اعتماد تھی۔

ابتداء میں اسلام اور مسلمانوں کے حالات میں جلد جلد تغیر و تبدل ہوتا رہتا تھا، مذہب کا جذبہ اور ایمان کا جوش بہت بڑھا ہوا تھا، ایک طرف قرآن مجید نازل ہو رہا تھا دوسری طرف لوگوں کو مسائل کی فکر تھی۔ ان حالات میں حضورؐ کا یہ خیال تھا کہ اگر لوگ آپؐ کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے تمام الفاظ قلب بند کرنے لگے تو ممکن ہے قرآن مجید کے ساتھ ساتھ آپؐ کے الفاظ بھی لکھ لیں اور آئندہ یہ دونوں چیزیں خلط غلط ہو جائیں، اس لیے شروع میں آپؐ نے حکم دیا تھا کہ مجھ سے قرآن مجید کے سوا اور کچھ نہ لکھو۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد جب آپؐ کو یقین ہو گیا کہ قرآن مجید کے بہت سے حافظ ہو گئے ہیں جو کلام اللہ اور اقوال رسولؐ میں تفریق کر سکتے ہیں، نئے مسلمان ہونے والوں کی تعلیم و تربیت کا نظام بن گیا ہے، اصحاب صفہ کی جماعت تعلیم دین کے حصول میں لگ گئی ہے، تو یہ نظر بڑی حد تک دور ہو گیا۔ پھر آپؐ نے اس بات کی عام اجازت دے دی کہ میں جو کچھ بھی اکھوں یا میری زبان سے جو کچھ بھی نکلے اس کو لکھ لو، اس لیے کہ اس منہ سے جو بھی نکلتا ہے وہ حق ہوتا ہے۔

اسی طرح ایک صحابی نے عرض کیا کہ حضورؐ آپؐ جو بھی فرماتے ہیں مجھے اچھا لگتا ہے لیکن یاد نہیں رہتا، آپؐ نے فرمایا اپنے داہنے ہاتھ سے مرد کو (یعنی لکھ لیا کرو) لے

لے حدیث کی کتابوں میں یہ سب تفصیلات موجود ہیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ جیسے جلیل القدر صحابی کی روایت سے یہ بات پوری طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی کتابت حدیث کا کام شروع ہو گیا تھا۔

حضرت زید بن ثابتؓ کے رسول اکرمؐ سے تقریباً اندازہً اسے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ کاتب وحی تھے، بڑے بڑے صحابہ ان کی ثقاہت اور دیانت داری کے قائل تھے، لیکن وہ کتابت حدیث کے قائل نہ تھے، ایک مرتبہ کسی نے ان کی روایات قلمبند کیں جب ان کو معلوم ہوا تو ضائع کر دیا۔ بالآخر مردان نے ان سے حدیث سننے کی فرمائش کی۔ ایک پردہ ڈلایا اور اس کے پیچھے ایک آدمی کو حدیث لکھنے کے لیے مقرر کیا۔ حضرت زید حدیث بیان کرتے اور پردہ کے پیچھے وہ آدمی لکھتا جاتا۔ اس طرح سے ان کی حدیثیں بھی جمع ہو گئیں جو بہت اہمیت رکھتی ہیں۔

حضرت علیؓ نے بھی بہت سی حدیثیں لکھ لی تھیں، ان کا یہ مجموعہ چڑے کے تھیلے میں ان کے ساتھ رہتا تھا، وہ کہتے تھے کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس صحیفے اور قرآن کے علاوہ کچھ نہیں سیکھا۔ اس صحیفے کو خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھوایا تھا، اس میں زکوٰۃ، خول ہا، اسیروں کی رہائی، کافر کے بدلے مسلمان کو قتل نہ کرنا، حرم مہینہ کے حدود اور اس کی حرمت، غیر کی طوت، انصاف کی معاونت، نقص عہد کی بُرائی، غیر کے نام پر دُک کرنا، پر دِید وغیرہ بہت سے احکام و مسائل درج تھے۔ حدیث کی اکثر کتابوں میں اس صحیفے کی روایتیں موجود ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں آپ کے صحابہ کو آپ کی باتیں لکھنے کا شوق ہو گیا تھا، اور بہت سے صحابہ کے پاس حدیثوں کا تحریری سرمایہ جمع ہو گیا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ فرماتے تھے کہ میں آنحضرتؐ کی زبان مبارک سے جو بھی سنتا حفظ کرنے کے خیال سے قلمبند کر لیتا تھا۔ حضرت ابو ہریرہؓ بھی اس کی تائید کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ صحابہ میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ کے علاوہ مجھ سے زیادہ حدیثوں کو روایت کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ لکھ لیا کرتے تھے اور میں لکھتا نہیں تھا۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی حدیثوں کا یہ مجموعہ ایک ضخیم کتاب کی شکل میں تیار ہو گیا تھا جس کا نام انھوں نے صادقہ رکھا تھا، ان کو اپنے اس مجموعے سے بہت محبت تھی اور اسے عزیز رکھتے تھے، فرماتے تھے: "صادقہ ایک صحیفہ ہے جو میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سُن کر لکھا۔"

حضرت عبداللہ بن عمروؓ اس کو بڑی اہمیت دیتے تھے، کہا کرتے تھے: "دو چیزوں کی وجہ سے مجھے زندگی عزیز ہے، ایک تو صحیفہ صادقہ کی وجہ سے اور دوسرے ابوہریرہؓ نامی اراخی کی بنا پر جو مجھے میرے والد نے عطا کی تھی۔" ائمہ ان کے انتقال کے بعد یہ نسخہ وراثتاً ان کے خاندان میں چلتا رہا، مسند احمد بن حنبلؓ میں یہ جوں کا توں محفوظ کر لیا گیا ہے۔ یہ صحیفہ اور اس سے متعلق

۱۔ بخاری، کتابتہ العلم  
۲۔ تفسیر العلم  
۳۔ علوم الحدیث  
۴۔ ایضاً ۴

حضرت رافع بن خدیج کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی تھی کہ وہ حدیثوں کو لکھ لیا کریں۔ چنانچہ انھوں نے آپ کی بہت سی احادیث کو قلمبند کر رکھا تھا اور ضرورت کے وقت لوگوں کو اس سے احکام و معلومات فراہم کرتے تھے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خاصے قریب تھے، اکثر آپ کے ساتھ رہتے تھے، انھوں نے بھی حدیثوں کی ایک بڑی تعداد جمع کر رکھی تھی، لوگ ان کے پاس آتے اور ان سے حدیثیں نقل کرتے تھے۔ جب لوگ ان سے احادیث و مسائل کے بارے میں پوچھتے تو وہ ایک چوکنگہ نکالتے اور فرماتے یہ وہ حدیثیں ہیں جو میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہیں اور ان کو لکھ کر حضور کے سامنے پیش بھی کر چکا ہوں۔ اس مجموعے کی بہت سی حدیثیں بخاری میں موجود ہیں۔

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے بھی بہت سی حدیثوں کو جمع کر لیا تھا خاص طور سے حج کے متعلق انھوں نے ایک کتاب جمع کی تھی، ان کے شاگرد وہب بن منبہ نے ان کی بیان کردہ حدیثوں کو ایک مجموعے کی شکل میں جمع کر رکھا تھا۔ حضرت عائشہ کی حیالات، شان اور ظلم و فضل سے بڑے بڑے نقباء متاثر تھے، اور مشکل مسائل میں ان سے مدد لیتے تھے، ان کی روایات سے حدیثوں کی کتابیں بھری ہوئی ہیں، ان کی حدیثوں کو بھی ان کے بھانجے اور شاگرد عروہ بن زبیر نے جمع کر دیا تھا۔ عورتوں میں حضرت عائشہ نے حدیثوں کی سب سے بڑی تعداد بیان کی ہے۔ حضرت عروہ کا نسخہ غالباً ضائع ہو گیا، لیکن بعض

دوسرے ذرائع سے یہ حدیثیں اور لوگوں کے پاس محفوظ تھیں جس کی تقلید حضرت عمر بن عبد العزیز نے تیار کر لیں۔ حضرت عروہ بنت عبد الرحمن اور قاسم بن محمد بن ابی بکر صدیقؓ دونوں حضرت عائشہؓ کے شاگرد تھے اور ان کی روایات کے سب سے بڑے عالم، ان کی روایات کو بھی جمع کیا گیا۔

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ جن کی شہرت مفسر قرآن کی حیثیت سے ہے ان کے متعلق روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام رافعؓ نے حضورؐ کی باتیں سن کر لکھا کرتے تھے، مختلف صحابہ کے گھروں پر جا کر بڑی محنت و جانفشانی سے حضورؐ کی ایک ایک بات معلوم کرتے تھے۔

امام ترمذی نے لکھا ہے کہ طائف کے کچھ لوگ ان کے پاس ان کی کتابوں کو لے کر حاضر ہوئے اور ان کے سامنے ان کو پڑھا۔ ان کے شاگردوں نے حدیث کی نشر و اشاعت میں بہت حصہ لیا، ان کی مجلس میں کچھ حدیثیں لکھتے تھے، جب کاغذ ختم ہو جاتا تو پھر پٹے پر لکھتے۔ سفر کی حالت میں کچھ نہ ملتا تو کجاوے کی لکڑی پر لکھتے۔

حضرت ابو ہریرہؓ نے حدیثوں کے حفظ و ضبط میں بہت محنت و جانفشانی سے کام لیا۔ آنحضرتؐ کی خدمت میں ہر وقت حاضر رہتے، ایک ایک بات غور سے سنتے اور اسے یاد رکھتے، انھوں نے رات کے تین حصے کیے تھے۔ ایک میں سوتے دوسرے میں عبادت کرتے اور تیسرے

کی تھیں جو ان کے بیٹے عبدالرحمن کے پاس محفوظ تھی۔ حضرت سعد بن عبادہ نے بھی ایک مجموعہ احادیث مرتب کیا تھا جو کئی پشت تک ان کے حناندان میں محفوظ رہا۔ اس کی روایات حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں۔ سعد بن ریح کے پاس بھی کئی چوٹی حدیثیں موجود تھیں، عبداللہ بن ابی ربیعہ سلمیٰ کے پاس بھی احادیث محفوظ تھیں۔ ابو موسیٰ اشعری بھی حدیثیں لکھ لیا کرتے تھے، وغیرہ بن شوہب، براہ بن عازب، عبداللہ بن ابی ادنیٰ وغیرہ بھی حدیثیں لکھتے اور جمع کرتے تھے۔

حدیثوں کے اس تحریری سرمایے کے علاوہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے معاہدات، صلحانے، احکامات اور خطوط وغیرہ بھی لکھے ہوئے موجود تھے مثلاً صلح حدیبیہ کا معاہدہ، شاہان مصر و روم و ایران کے نام آپ کے خطوط، فتح مکہ کے بعد آپ نے جو خطبہ دیا تھا ابو شاہ یمنی کی درخواست پر انھیں لکھوایا تھا۔ زکوٰۃ و صدقات سے متعلق احکامات ابو یزید حزم دانی بحرن کو لکھوائے تھے۔ یہ احکامات بعض دوسرے امراء کو بھی بھیجے گئے تھے۔ حاکم یمن عمرو بن حنظلہ کو تقریر کے وقت ایک تحریر لکھوائی تھی جس میں فرائض، صدقات، طلاق، صلوة وغیرہ سے متعلق ضروری احکامات تھے۔

عبداللہ بن حکیم کے پاس بھی آپ کی طرف سے ایک تحریر تھی جس میں مردہ جانوروں سے متعلق احکام تھے۔ دائل بن جحر کو نماز، روزہ، سودا و شراب وغیرہ سے متعلق ضروری باتیں لکھوائی تھیں۔ حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن ایک تحریر لکھوائی تھی جس میں بسزویں وغیرہ پر زکوٰۃ نہ لینے کا حکم تھا۔ ان تمام

میں حدیثیں یاد کرتے۔ شروع میں حدیثوں کو نہ لکھتے تھے لیکن بعد میں انھوں نے اپنی تمام روایات کو تحریری طور پر محفوظ کر لیا تھا، جب کسی قسم کا شک و شبہ پیدا ہوتا تو اس مجموعے سے اس کی تصدیق کرتے۔

عمرو بن امیہ کا بیان ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کے سامنے ایک حدیث پر گفتگو ہوئی تو وہ میرا ہاتھ بکڑ کر اپنے گھر لے گئے اور ہمیں احادیث کی کتابیں دکھائیں اور کہا دیکھو وہ حدیث میرے پاس لکھی ہوئی ہے۔

حضرت ابو یزیدؓ نے بھی حدیثیں جمع کی تھیں مگر پھر انھیں جلادیا اس خیال سے کہ مبادا اس میں بعض ایسی احادیث بھی ہوں جو آپ کو ابھی طرح سے یاد نہ رہی ہوں بلکہ اور بھی بہت سے دوسرے صحابہ نے اپنے درجہ و توقوٰی کی بنا پر لکھی ہوئی حدیثیں ضائع کر دیں کہ ممکن ہے انھوں نے کوئی بات غلطی سے لکھ لی ہو۔

حضرت سمرہ بن جندبؓ کے پاس حدیثوں کا تحریری سرمایہ تھا جو ان کے بعد ان کے بیٹے سلیمان کے پاس رہا، حضرت حسن بصریؒ اور سلیمان بن سمرہ نے اس صحیفے سے بہت سی روایات نقل کی ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسودؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خاص تعلق تھا خدمت مبارک میں اس قدر حاضر رہتے تھے کہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ یہ گھر کے فرد ہیں۔ ابتدا میں کتابت حدیث کے قائل نہ تھے لیکن بعد میں خود بھی لکھتے اور شاگردوں کو بھی لکھاتے، انھوں نے بھی حدیثیں کتابی شکل میں جمع

لے فتح الباری، ج ۱، ص ۲۱۱، ابن ماجہ اور علم حدیث ص ۱۲۲

لے تذکرہ الخلفاء، ص ۱۱۱، ابن ماجہ اور علم حدیث ص ۱۲۲

فرق نہیں ہے، اس میں ۱۳۸ حدیثیں ہیں۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے اسے مرتب کر کے شائع کر دیا ہے۔ اس صحیفے کی تمام احادیث احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں روایت کی ہیں اور صحیحین میں بھی اس کی روایتیں موجود ہیں۔

سعید بن جبیر کا بیان ہے کہ میں رات کو حضرت عبداللہ بن عباس کے ہرکاب ہوتا وہ مجھ سے کوئی حدیث بیان کرتے تو کھ لیتا تھا، ان لوگوں کے علاوہ عبداللہ بن عقیل، ابان، عبداللہ بن خش، حسن بن جابر، ابو بردہ اشعری وغیرہ اصحاب رسولؐ سے سن کر حدیثیں لکھتے اور ان کی اشاعت کا اہتمام کرتے۔

عہد صحابہ کے بعد تابعین کے دور میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا اور حفظ حدیث کا دیا ہی انتظام کیا گیا جیسا کہ قرآن کریم کا تھا۔ بچوں کو جس طرح قرآن مجید یاد کرایا جاتا اسی طرح سے حدیثوں کو بھی زبانی یاد کراتے۔ ان حدیثوں کو اس طرح زبانی یاد کرانے کے بعد یہ لوگ اسے دہراتے بھی بستے تھے۔ مگر حافظے میں موجود رہے۔ اسی کے ساتھ چونکہ اب لکھنے کا فن عوام ہوا تھا اور مسائل بھی نسبتاً زیادہ میسر تھے اس لیے حدیثیں باقاعدہ فن کی شکل میں مرتب ہونے لگی تھیں۔ بعد میں علما نے حفاظ حدیث کے حالات میں مستقل کتابیں بھی لکھی ہیں جن میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو اپنے زمانے میں حدیث کے حافظ کہے جاتے تھے۔ ان میں چند مشہور کتابیں یہ ہیں:

- ۱۔ اسماء الحفاظ از حافظ ابوالوید یوسف بن عبد العزیز المذہبی ۵۲۶ھ
- ۲۔ اخبار الحفاظ علامہ ابن جوزی ۵۹۷ھ

باتوں کا ذکر بخاری، ابوداؤد، مسند احمد بن حنبل، دارقطنی اور طبقات ابن سعد وغیرہ میں موجود ہے۔

جس طرح سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں لوگوں کو حدیثیں لکھنے اور جمع کرنے کا شوق تھا۔ اسی طرح سے صحابہ کرام کے دور میں بھی لوگوں کی دل چسپی اس فن کو آگے بڑھانے میں رہی، جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں چھوٹے بچے تھے یا بعد میں پیدا ہوئے تھے ان کو قدرتی طور پر اپنے رسولؐ کے حالات جاننے اور ان کی باتیں سننے کا شوق تھا، اس لیے یہ لوگ بزرگ صحابیوں کے پاس جمع رہتے اور ان سے حدیثیں سن کر لکھ لیتے، بعد میں یہ مجموعے بڑی اہمیت کے حامل ہوئے اور حدیثوں کی حفاظت و اشاعت کا بڑا ذریعہ بنے۔

بشیر بن ہبیک (تابعی) حضرت ابو ہریرہؓ کی خدمت میں حاضر رہتے تھے، جو بھی حدیث سنتے لکھ لیتے، جب ان سے رخصت ہونے لگے تو اس کتاب کو لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تمام حدیثیں پڑھ کر سنائیں پھر ان سے پوچھا کہ میں نے جو کچھ آپ کو سنایا وہ سب آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔ انھوں نے جواب دیا ہاں۔

ہمام بن منہب یمانی حضرت ابو ہریرہؓ کے خاص شاگرد تھے، حضرت ابو ہریرہؓ نے حدیثوں کا ایک مجموعہ ان کے لیے مرتب کیا تھا، یہ مجموعہ ہمام کی روایت سے پورا کا پورا محفوظ ہو گیا، ڈاکٹر محمد حمید اللہ کو اس صحیفے کے دو خطوط ایک برتن میں اور دوسرا دمشق میں ملا، ان دونوں میں ذرا بھی



ان علاقوں میں بھی اس کا خاطر خواہ اثر ہوا، اس وقت مدینہ میں سعید بن المسیب، کونے میں امام شعی، بصرہ میں حسن بصری اور شام میں مکحول جیسے عالم موجود تھے، ان لوگوں نے احادیث کی تصحیح و تدوین اور اشاعت میں بڑا حصہ لیا، ان کے شاگردوں نے ان سے حدیثوں کو سیکھا، لکھا اور دوسروں تک پہنچایا۔

صحابہ کے بعد تابعین، ان کے بعد تبع تابعین نے حدیثوں کی تلاش و جستجو اور تدوین کا کام جاری رکھا۔ ابن شہاب زہری، ہشام بن عروہ، قیس بن ابی حازم، عطاء بن ابی رباح، سعید بن جبیر وغیرہ سیکڑوں تابعین کے اسماء خاص طور پر قابل ذکر ہیں جو ایک ایک سے پوچھ پوچھ کر ہر دروازے پر جا کر بوڑھے، جوان، مرد، عورت، سب سے تحقیق کر کے احادیث جمع کرتے۔ مدینہ منورہ چونکہ ابتداء اسلام میں مرکزی حیثیت رکھتا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کے ساتھ یہاں اپنی زندگی کے اہم ترین دن گزارے تھے، یہاں کے لوگ رسول اکرم کی زندگی کے گوشے گوشے سے واقف تھے، اس لیے قدرتی طور پر یہاں حدیث کا جتنا بڑا خزانہ موجود تھا دوسری جگہ نہ ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس علم کے پیاسے مدینہ ہی کی طرف بھاگتے تھے، تدوین حدیث کے ابتدائی مراحل یہیں طے ہوئے۔ اس کے بعد یہ سلسلہ پھیلنے لگا، بہت سے وہ صحابی اور کبار تابعین جو مدینہ سے باہر چلے گئے تھے لوگ ان کے پاس جا کر علم حدیث حاصل کرنے لگے۔ یہ شوق اس قدر بڑھ گیا تھا کہ تلاش حدیث کے لیے دور دراز کے سفر کی تکلیفیں اٹھانا ان لوگوں کی متناہی نہ تھی۔

فیضانِ علم کے مطابق حدیث کی روایات کو جمع کیا، لیکن قبل اس کے کہ یہ کتابیں حضرت عمر بن عبدالعزیز کو بھیجی جائیں ان کا انتقال ہو گیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے خط کا اثر جن لوگوں نے قبول کیا ان میں قاز و شام کے مشہور عالم محمد بن مسلم بن شہاب زہری (دہلی ۱۱۳۱ھ) بھی تھے، انھوں نے بڑے اہتمام کے ساتھ یہ کام کیا اور حدیث کی ایک کتاب مرتب کی، حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اس کی نقلیں تیار کرا کے اپنی حکومت کے مختلف علاقوں میں بھجوائیں، امام زہری اپنی اس کوشش کے سلسلے میں کہا کرتے تھے:

”اس علم کو میری طرح مجھ سے پہلے کسی نے بھی دون نہیں کیا۔“

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مدینہ میں حدیث کی باقاعدہ تدوین کی ادیت کا سہرا امام زہری کے سر ہے۔ امام زہری مشروع میں کتابت حدیث کے قائل نہ تھے، لیکن پھر کچھ تو اُمرائے وقت کے مجبور کرنے سے اور کچھ حدیث رسول کے مٹ جانے کے ڈر اور موضوع احادیث کے بچھل جانے کے خطرے سے حدیثوں کو لکھنے اور ان کی نشر و اشاعت کے پوری طرح سے قائل ہو گئے تھے، لیکن حضرت عمر بن عبدالعزیز کا مقصد یہ نہ تھا کہ صرف کسی ایک علاقے میں تدوین حدیث کا کام ہو۔ آپ نے جو فرمان جاری کیا تھا وہ مختلف علاقوں میں بھیجا گیا تھا اور



”ان میں سے جو عظیم القدر علما تھے انھوں نے طلب حدیث کے لیے اور اس میں تبحر حاصل کرنے کی غرض سے بلاد حجاز، ملک شام، عراق، مصر، یمن اور خراسان کا سفر کیا۔ کتب حدیث کو متعدد شیوخ و اساتذہ سے حاصل کی، مختلف نسخے حدیث کے تلاش کیے اور غرائب الحدیث اور نوادر آثار کے جمع کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا۔۔۔۔۔ ان کی کوششوں سے احادیث و آثار کا ایک عظیم الشان ذخیرہ جمع ہو گیا جو پہلے کبھی جمع نہیں ہوا تھا۔“

سعید بن المسیب ایک ایک حدیث کی تلاش میں کئی راتیں اور کئی دن مسلسل سفر کرتے تھے۔ ابو ظاہر تین دن مدینہ میں صرف اس لیے ٹھہرے کہ وہ کسی سے ایک حدیث سننا چاہتے تھے۔ محول ایک حدیث کی تلاش کے لیے حجاز، عراق، شام اور مصر گئے۔ ان کے علم و فضل کے ان کے ہم عصر معترف تھے۔ امام اوزاعی ان کے شاگرد تھے۔

امام زہری کے متعلق مورخین نے لکھا ہے کہ انھوں نے بڑی محنت و کوشش سے اقوال و حالات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام گھروں پر جاتے اور ایک ایک سے تفصیلی حالات پوچھتے اور جمع کرتے۔ احمد بن حنبل جو بعد ان کے نام سے مشہور تھے اٹھارہ مرتبہ مصر گئے تاکہ ایوب بن کيسان سے حدیثیں سن سکیں۔ بہت سے لوگوں

کو الگ مضامین کی احادیث جمع کرنے کا شوق ہوتا تھا، علامہ بیہقی نے لکھا ہے کہ امام شعبی نے ایک مضمون کی حدیثوں کو جمع کرنے کا کام سب سے پہلے کیا، اس طرح سے توبیہ احادیث کے بانی آپ ہی سمجھے جاتے ہیں۔ ابتدا میں کتابت حدیث کے قائل نہ تھے مگر حضرت عمر بن عبد العزیز کے حکم کو پورا کرنے کی غرض سے یہ کام کیا۔ تذکرۃ الحفاظ میں ہے کہ کونہ میں قاضی تھے اور اس دور میں ان سے زیادہ علم حدیث کا جاننے والا کوئی دوسرا موجود نہ تھا۔

غرض اس طرح سے اور بھی بہت سے لوگوں کے متعلق تذکروں میں لکھا ہے کہ دور دراز کے سفر کے احادیث کو جمع کرتے تھے، بہت سے لوگ ذوق و شوق میں پیدل ہی سفر کرتے تھے، کبھی کبھی یہ سلسلہ بچپن ہی سے شروع ہو جاتا تھا اور راہ کی بحالیٰ ان لوگوں کے لیے لذت آمیز ہوتی تھیں۔ رجال کی کتابوں میں ایسے لوگوں کے ذوق و شوق کی بہت تعریف ملتی ہے اور ان کے سفروں اور اس سلسلے کے مصائب کا ذکر خاص طور سے ہوتا ہے اور اس سے ان کی حیثیت کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ اکثر محدثین نے ایک ہی حدیث کی تلاش میں بہت سی جگہوں کے سفر کیے، اس سے حدیث کے الفاظ کی ہم آہنگی و ہم رنگی میں بڑی مدد ملی اور تضاد و اختلاف دور ہوا، ساتھ ہی ساتھ راویوں کی چھان بن بھی ہوتی رہی۔ غرض اس طرح سے مختلف زمانوں میں حدیث کا سرمایہ سینوں سے نکل کر سفینوں

حدیث نبوی کے سلسلے میں ہر دور میں بے شمار کتابیں علماء اپنے اپنے ذوق اور نقطہ نظر کے مطابق جمع کرتے رہے۔ ان میں سے کچھ کتابیں شاخ ہوئیں اور لوگ ان سے روشناس ہوئے لیکن بہت سی کتابیں غیر مطبوعہ رہیں جن میں سے کچھ شاخ ہو گئیں اور کچھ دنیا کے مختلف کتب خانوں میں اور اہل علم کے خاندانوں میں ذاتی ملکیت کے طور پر پڑی ہیں۔ حدیث کی یہ تمام کتابیں جو مختلف زمانوں میں مرتب ہوئیں علمائے ان کو مختلف طبقات و مراتب میں تقسیم کیا ہے۔ اس میں صحیح بخاری، صحیح مسلم اور موطا امام مالک پہلا طبقہ ہیں۔ ان میں متواتر صحیح اور حسن حدیثیں ہیں اور ان سے احکام شریعت کا استنباط کیا جاتا ہے۔

اس میں سنن ابی داؤد، مسند احمد بن حنبل، سنن دومر طبقہ نسائی اور ابن ماجہ و جامع ترمذی شامل ہیں۔ اس طبقہ کی حدیثیں پہلے طبقہ سے قدرے کم درجے کی ہیں، ان کو قبول عام کی سند ملی ہے اور ان سے بہت سے علوم و احکام کا استخراج کیا گیا ہے۔ اس طبقہ کی حدیثیں بھی مسائل شرعیہ کے لیے سند کے طور پر پیش کی جاتی ہیں۔ اس میں وہ کتب حدیث شامل ہیں جن میں ضعیف تیسرا طبقہ حدیثیں پائی جاتی ہیں اور ان کے اکثر راویوں کا حال پوری طرح سے معلوم نہیں ہے۔ مثلاً: مسند ابن ابی شیبہ، مسند طحاوی، طحاوی و حماد بن زید۔ ان کتابوں سے صرف وہ علمائے حدیث فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو حدیث سے پوری طرح واقف ہوں اور اسناد الرجال کی روشنی میں ان کے کھرے کھولے کو سمجھ سکتے ہوں۔

میں محفوظ ہونے لگا۔ بہر حال پہلی صدی کے آخر میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے باقاعدہ سرکاری طور پر تدوین حدیث کا دروازہ کھلا۔ اب ہمک جو لوگ ذاتی طور پر اس علمی کام کو انجام دیتے تھے اب خلیفہ وقت کے حکم سے اسی کام میں لگ گئے اور دوسری صدی ہجری میں اس سلسلے کو اتنی ترقی ہوئی کہ احادیث رسول کے ساتھ ساتھ آثار صحابہ اور تابعین کبار کے فتاویٰ کو بھی مدون کر دیا گیا۔ مسلمانوں میں احادیث کی جمع و تدوین کے تین دور ہیں :

- (۱) جب ہر شخص نے اپنی ذاتی معلومات کو جمع کیا۔ یہ دور لگ بھگ ۱۰۰ سال تک رہا، یہ دور صحابہ اور اکابر تابعین کا تھا۔
- (۲) اس دور میں مختلف شہروں کی معلومات کو یکجا کیا گیا، یہ دور ۱۰۰ سال تک رہا، یہ دور تابعین کا تھا۔
- (۳) اس دور میں تمام دنیا کے اسلام کی حدیثوں کی تدوین ہوئی اور موجودہ کتب احادیث مرتب کی گئیں، یہ دور تیسری صدی ہجری تک رہا، یہ دور اصحاب صحاح کا تھا۔

پہلے دور کا تمام تر سرمایہ دوسرے دور کی کتابوں میں جمع ہوا اور دوسرے دور کا پورا مواد تیسرے دور کی کتابوں میں پھیلا دیا گیا اور یہی تمام سرمایہ آج ہزاروں اوراق میں ہمارے پاس موجود ہے اور دنیا کی تاریخ کا سب سے قیمتی اور معتبر و مستند ذخیرہ تقسیم کیا جاتا ہے۔

اس طبقے میں وہ کتابیں شامل ہیں جس میں نبیؐ  
چوتھا طبقہ روایات بخرت ہیں اور زیادہ قابل اعتماد نہیں ہیں۔  
عام طور سے یہ افسانہ گو داستانوں، موشن اور غیر ثقہ برقی نوگوں سے سن کر  
لکھی گئی ہیں، ان میں ابن مردودہ، ابن شاہین اور ابوالشیخ کی تصانیف  
ہیں، علمائے حدیث اس طبقے کی کتابوں کو مستند نہیں سمجھتے۔  
حدیث کی سب سے اہم اور مشہور کتابیں چھ ہیں، ان کی صحت کی وجہ  
سے ان کو صحاح ستہ کہا جاتا ہے، یہ کتابیں ہیں:

- |          |          |             |
|----------|----------|-------------|
| ۱۔ بخاری | ۲۔ مسلم  | ۳۔ ابوداؤد  |
| ۴۔ ترمذی | ۵۔ نسائی | ۶۔ ابن ماجہ |
- ان سب کا تفصیلی ذکر آئندہ ادراک میں کیا جائے گا۔

## اصول حدیث

جیسا کہ کتاب کے شروع میں بیان ہو چکا ہے، علم حدیث  
مسلمانوں میں علم قرآن کے بعد سب سے اہم علم ہے، یہ ایک طرح  
سے قرآن کی تشریح اور اس کی تکمیل ہے، مسلمانوں نے اس کی  
حفاظت اسی طرح سے کی جس طرح سے کہ قرآن مجید کی بلکہ اگر یہ  
کہا جائے کہ حدیث کی طرف توجہ زیادہ رہی تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ قرآن  
مجید کی تدریس تو ایک بار ہو گئی اور ہمیشہ کے لیے ہو گئی۔ اب اس  
کی تفسیر اور اس کے اصول و ضوابط میں توجہ ہو سکتی ہے لیکن  
اس کی ترتیب و تدوین وغیرہ متعلق جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور  
خلفائے راشدین کے زمانے میں ہو گیا اس میں کسی قسم کی جہت یا  
رد و بدل نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی اس کی ضرورت کبھی محسوس ہوئی  
اور نہ ہوگی۔ لیکن فن حدیث کوئی ایسی چیز نہ تھی کہ اس کو کسی ایک  
انڈاز پر مدون کر دیا جاتا۔ اس میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی

”وہ آدمی خوش نصیب ہے جس نے مجھے دیکھا اور  
مجھ پر ایمان لایا۔“  
اپنے اصحاب کرام کے متعلق آپ نے فرمایا:  
”میرے ساتھی ستاروں کی طرح سے ہیں، ان میں  
سے تم جس کی بھی اقتدا کر دیکھو راستے پر پہنچو گے۔“  
اور یہی وجہ تھی کہ صحابہ کے متعلق یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ:  
”الصحابۃ کلہم عدل“ (صحابہ سب کے سب  
معتبر ہیں۔)

اس لیے ان پر چھوٹی حدیث بیان کرنے کا شبہ بھی نہیں کیا جاسکتا  
ان صحابہ سے معتبر تابعین نے جو روایات بیان کیں وہ عام طور سے  
صحیح تسلیم کی گئیں۔ البتہ اس کے بعد جو دور آیا اس میں چونکہ اسلام  
دور دراز کے علاقوں تک پہنچ گیا تھا اور لوگ رسول اکرم کی باتوں  
کو اپنے اپنے الفاظ اور طریقوں سے بیان کرنے لگے تھے اس لیے  
عقائد میں فتور پیدا ہونے کا خطرہ ہو گیا تھا اور اس بات کا اندیشہ  
تھا کہ مختلف لوگوں اور مختلف ذریعوں سے بیان کی ہوئی روایت  
میں حدیث کے علاوہ دوسری باتیں نہ شامل ہو جائیں۔ اسی کے  
ساتھ ساتھ یہودیوں اور مسلمانوں کے دوسرے مخالفین سے اس  
بات کا خطرہ تھا کہ وہ اس کے الفاظ و مفہوم میں الٹ پھیر نہ کرنے  
لگیں، اور یہ حقیقت بھی ہے کہ بہت سے ایسے کذاب پیدا ہو گئے  
تھے جنہوں نے من گھڑت حدیثیں بیان کرنا شروع کر دی تھیں، اس  
لیے علماء حدیث نے اسماء الرجال کے فن کی طرف توجہ کی جس کا مقصد

ابتدائی تاریخ کے ساتھ حکومت، سماج، مذہب اور دنیا کے بے شمار  
مسائل کا تذکرہ ہے جس کی تحدید کوئی بہت آسان کام نہ تھا۔ مسلمانوں  
نے اس کی حفاظت اور تدوین کے لیے جس سوچ بوجھ، ذمے داری اور  
لگن کے ساتھ کام کیا اس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔  
یہ ایک غیر معمولی بات ہے کہ مسلمانوں نے اپنے رسول کے ایک ایک قول  
اور ایک ایک عمل کو نہ صرف پوری طرح محفوظ رکھا بلکہ دوسروں  
تک پہنچایا بھی۔

راویوں کی جرح و تعدیل کا کام اگرچہ شروع ہی سے ہورہا تھا  
لیکن تیسری صدی ہجری میں علماء حدیث نے اس فن کو باضابطہ  
مردن کیا، حدیث کا جتنا بھی سرمایہ جن ذرائع سے بھی ممکن تھا جمع  
کیا گیا، اس کے بعد ان کی صحت کو پرکھنے کی طرف توجہ ہوئی اور  
اسماء الرجال کا فن ایجاد ہوا۔ صحابہ کے دور میں حدیثوں کو بیان  
کرنے والے وہی لوگ تھے جنہوں نے خود حضور اکرم کو دیکھا تھا یا  
ساتھ رہے تھے، اور چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بار بار یہ اعلان تھا  
کہ جو شخص میری طرف جھوٹ بات منسوب کرے گا اس کا ٹھکانہ جہنم ہے  
اس لیے صحابہ بڑی احتیاط کرتے تھے اور پوری طرح اطمینان کیے بغیر  
رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بات منسوب نہ کرتے تھے۔ اس کے بعد تابعین کے دور میں وہ  
لوگ تھے جنہوں نے صحابہ کو دیکھا اور ان سے حدیث روایت کی۔

اپنے زمانے کے متعلق آپ نے فرمایا تھا: ”سب سے بہتر میرا  
زمانہ ہے۔“  
ایک اور جگہ آپ نے فرمایا:

کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔" لہ

بہر حال اس فن کی ایجاد کے بعد یہ کام آسان ہو گیا کہ راویوں کی روایت کی جانچ پڑتال کی جاسکے۔ فن جرح و تعدیل رواقہ کی اسی چھان بن اور جانچ پڑتال کا نام ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے صحابہ کے زمانے ہی سے اس فن کی ابتدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس (۹۶ھ) اور حضرت انس بن مالک (۹۳ھ) اس دور میں تابعین کے دور میں امام شعبی (۱۰۴ھ) ابن سیرین (۱۱۰ھ) شعبہ (۱۶۰ھ) امام مالک (۱۴۹ھ) اس کے بعد کے دور میں ابن مبارک (۱۸۱ھ) ابن عیینہ (۱۹۶ھ) یحییٰ بن سعید قطان (۱۹۸ھ) وغیرہ اس فن کے امام بنے۔ علامہ طاہر جزائری لکھتے ہیں:

"جن لوگوں نے سب سے پہلے (یحییٰ بن سعید قطان کے بعد) فن جرح و تعدیل پر تالیف کی اور کلام کیا۔ اس طبقے میں یحییٰ بن عیینہ (۲۲۱ھ) احمد بن حنبل (۲۴۱ھ) اور محمد بن سعد کا تبار الواقدی اور صاحب الطبقات (ابن سعد زہری ۲۳۰ھ) اور علی بن المدینی (۲۳۴ھ) ہیں۔ ان کے بعد امام بخاری، امام مسلم، ابودرداء، رازی، ابوحاتم، ابو داؤد سجستانی آئے۔ ان حضرات کے بعد بحشر

یہ تھا کہ حدیث بیان کرنے والے تمام اشخاص کے تفصیلی حالات جمع کر دیے جائیں۔ یہ کوئی معمولی کام نہ تھا کہ ہر روایت کی سند میں جتنے بھی نام آئیں ان میں سے ہر ایک کے حالات کو یکجا کیا جائے، اور حالات میں بھی صرف یہ نہیں کہ کیا نام تھا، کہاں پیدا ہوئے، باپ کون تھے وغیرہ بلکہ یہ باتیں کہ وہ کس قسم کے انسان تھے، کیا کرتے تھے، چال چلن کیسا تھا، کھانے پینے میں کس قسم کی چیزیں استعمال کرتے تھے، رہن بہن کیسا تھا، ملنے جلنے اور ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے کیسے تھے، سمجھ بوجھ کیسی تھی، سماج میں ان کا کیا مرتبہ تھا، تعلیم و تربیت کس ماحول میں اور کیسی ہوئی تھی، ذہن اور حافظہ کیسا تھا، کس قبیلے اور کس نژاد سے تعلق تھا، تحصیل علم کے لیے کہاں کہاں گئے، اساتذہ کون کون تھے، غرض یہ کہ انسان کی زندگی کی پوری تفصیل اس فن کے تحت جمع کی جاتی تھی۔ اس وقت جب تذکرہ نویس اور تاریخ کا فن پوری طرح سے رائج نہ تھا یہ کام کتنا مشکل اور مبر آزار رہا ہوگا۔ محدثین راویوں کے حالات کی تحقیق کے لیے دودر دراز کے سفر کرتے، لوگوں سے مل کر حالات معلوم کرتے، خود اس شخص سے مل کر اس کے ذاتی حالات کے متعلق سوال در سوال کرتے اور ایک ایک بات کو نوٹ کرتے۔ محدثین نے اپنی عمریں اس کام کے لیے وقف کر دیں، ایک ایک شہر میں گئے اور ذاتی تحقیقات کی بنیاد پر اسماء الرجال کا فن مرتب کیا۔ ڈاکٹر اسپرنگر نے لکھا ہے:

"کوئی قوم دنیا میں ایسی نہیں گزری، نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال کا علم نشان فن ایجاد کیا ہو جس کی بدولت آج پانچ لاکھ اشخاص

لے بحوالہ خطبات مدر اس ص ۱۴

لے علوم الحدیث ص ۱۴

لوگوں نے طبقہ بعد طبقہ ساتویں صدی ہجری کے  
ادوار تک رجال پر کتابیں تالیف کیں اور اس پر  
بحث کی، اور اس کا اہتمام کیا یہاں تک کہ کتب  
حدیث میں کوئی راوی ایسا نہیں ہے کہ ان حضرات  
کی تالیفات میں اس کی تاریخ بھولت نہ مل سکے بلکہ

محدثین نے راویوں کے حالات کی چھان بین اور کھرے کھوٹے  
کو الگ کرنے میں کسی قسم کی رو رعایت سے کام نہ لیا۔ ایسر وغریب  
چھوٹے بڑے اور باپ بیٹے کسی کو بھی مستثنیٰ قرار نہ دیا گیا، اگر تباہی  
تنقید تھا تو پوری طرح سے تنقید کی گئی، اگر ثقہ تھا تو اس کے دلائل  
پیش کیے گئے۔ امام بخاری کے شیخ علی بن مدینی سے ان کے والد  
کے سلسلے میں اصرار سے پوچھا گیا تو جواب دیا، 'دین کا معاملہ ہے'  
میرے والد ضعیف راوی ہیں، امام دبیج کے والد سرکاری خزانے  
کے ذمے دار تھے اس لیے امام دبیج ان کی کسی ایسی روایت کو  
تسلیم نہ کرتے تھے جو صرف ان سے مروی ہو۔ امام ابو داؤد نے اپنے  
بیٹے کے بارے میں فرمایا کہ وہ کذاب ہے۔ محدثین نے ایسے لوگوں کی  
روایات کے بارے میں بھی تشدد سے کام لیا ہے جو سڑکوں پر سیر  
تفریح کرتے، بازاروں میں کھاتے پیتے، ہنسی مذاق میں حد سے بڑھ  
جاتے تھے یہ اس قسم کے بے شمار واقعات موجود ہیں جو اس

۱۔ فن اسماء الرجال ص ۴۴ بحوالہ توجہ النظر ص ۱۱

۲۔ فن اسماء الرجال ص ۴۴ بحوالہ فتح المغیث ص ۱۱

۳۔ علوم الحدیث ص ۱۱۰ بحوالہ الکفایہ ص ۱۱

فن میں احتیاط اور دیانت داری کی نمایاں مثال ہیں۔

محدثین کرام نے حدیث کے متن اور سند دونوں کو جانچنے کے  
لیے ایسے اصول و ضوابط بنادیے ہیں جن سے کھرے اور کھوٹے کو  
پوری طرح سے الگ الگ کیا جاسکتا ہے، کچھ ایسی علامات بھی  
متعین کیں کہ اگر ان میں سے کوئی ایک بھی پائی جائے تو حدیث کو  
قبول نہ کیا جائے گا۔ مثلاً:

۱۔ جو حدیث وقار نبوی کے خلاف ہو۔

۲۔ نص قرآنی یا حدیث متواتر کے خلاف ہو۔

۳۔ خلاف عقل ہو۔

۴۔ مشاہدات کے مطابق نہ ہو۔

۵۔ جس حدیث میں معمولی نیکی پر بڑے اور بزرگ کے برابر ثواب کا

وعدہ ہو یا معمولی گناہ پر شدید عذاب کی وعید ہو۔

۶۔ کوئی ایسا واقعہ جس کے بہت سے راوی ہو سکتے تھے مگر صرف

ایک ہی شخص اس کو بیان کر رہا ہو۔ وغیرہ

اسی طرح سے کسی راوی کی روایت کو قبول کرنے کے لیے اس

میں چار باتوں کا پایا جانا ضروری ہے:

(۱) عقل (۲) ضبط

(۳) عدل (۴) اسلام

۱۔ محدثین کی اصطلاح میں عام طور سے عقل سے مراد تیز و شعور

ہے، حدیث کو سمجھنے اور دوسروں تک پہنچانے کے لیے بالغ

ہونا بھی ضروری ہے، البتہ بعض علما نے اس کی اجازت

دی ہے کہ اگر کوئی بچہ بہت کچھ دار ہو تو وہ حدیث تو اخذ کر سکتا ہے مگر روایت نہیں کر سکتا۔ بعض محدثین نے روایت حدیث کے لیے تیرہ یا پندرہ سال کی عمر کی قید لگائی ہے۔

۲۔ ضبط سے مراد یہ ہے کہ حدیث کو اچھی طرح سے سنا اور سمجھا ہو اور اس طرح سے ذہن نشین کیا ہو کہ شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے اور سننے کے وقت سے لے کر روایت کرنے کے وقت تک اس میں کوئی فرق نہ ہوا ہو۔ گویا ضبط کے لیے قوت حافظہ فیئادی شرط ہے۔

۳۔ عدل سے مراد ہے کہ راوی دینی معاملات میں پختہ ہو، فسق و فجور، غیر اخلاقی وغیرہ شرعی معاملات سے الگ ہو کسی شخص کے عدل کا پتہ عام طور سے اس کے اعمال و افعال اور معاملات کی آزمائش کے بعد ہی لگایا جاسکتا ہے۔ محدثین نے اس سلسلے میں بھی پوری دیانت داری کے ساتھ راویوں کے عدل کی تحقیق کی اور انہی لوگوں کی روایتوں کو کتاب میں قبول سمجھا جو اپنے ایمان میں ہر طرح سے مستحکم تھے۔

۴۔ آخری شرط اسلام قدرتی طور پر لازمی ہے اس لیے کہ راوی احادیث کو دوسروں تک پہنچاتا ہے، احادیث چونکہ امور شرعیہ کی تشریح و توضیح ہیں اس لیے ضروری ہے کہ ان کو بیان کرنے والا خود بھی ان کی اہمیت اور مذہبی حیثیت سے پوری طرح واقف ہو اس لیے احتیاط کا تقاضا ہے

کہ وہ مسلم ہوتا کہ کچھ بوجھ کر روایت کر سکے۔

اسی طرح سے ان لوگوں کی روایت قبول نہ ہوگی جن کا:

۱۔ راوی جھوٹا ہو اور اس کا جھوٹ ثابت ہو چکا ہو۔

۲۔ راوی ایسے شخص سے روایت کرے جس سے اس کی ملاقات ثابت نہ ہو یا جس جگہ جاکر سننے کا ذکر ہے وہاں گیا ہی نہ ہو یا اس کی وفات کے بعد پیدا ہوا ہو۔

۳۔ جن لوگوں کے اخلاق میں کسی قسم کی مسمولی خامی بھی پائی گئی ہو۔

۴۔ جو لوگ عام گفتگو میں سچ نہ بولتے ہوں وغیرہ۔

علوم الحدیث اور فن اسماء الرجال کے سلسلے میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں اس سے متعلق تمام باتوں پر پوری طرح سے بحث کی گئی ہے اور تمام راویوں کے حالات کو جمع کر دیا گیا ہے ان میں سے چند کا ذکر درج ذیل ہے:

۱۔ ابن سعد زہری بصری (۲۳۰ھ) نے طبقات ابن سعد مرتب کی بہت جاح کتاب ہے اس میں سیرۃ نبویہ کے بعد کے حالات صحابہ و تابعین سے لے کر اپنے دور تک کے علماء کے حالات لکھے ہیں یہ کتاب پندرہ جلدوں میں ہے۔

۲۔ امام احمد بن حنبل (۲۴۱ھ) نے المجرح والتعدیل مرتب کی۔

۳۔ امام بخاری (۲۵۶ھ) نے تاریخ الکبیر مرتب کی اس کی ترتیب حروف بحم کے اعتبار سے ہے، مہذب صحابہ سے

اپنے دور تک کے لوگوں کے حالات لکھے ہیں۔ یہ کتاب دائرۃ المعارف حیدرآباد سے شائع ہوئی۔

۴۔ عبدالرحمن بن ابوجانم رازی (۳۲۷ھ) نے المجروح والقعطل کے نام سے کتاب لکھی جس میں اس فن سے متعلق اہم ائمہ کے اقوال کو جمع کر دی گئی ہے۔ یہ کتاب بھی حیدرآباد سے شائع ہوئی۔

۵۔ ابویوسف عمر بن عبدالبر (۴۶۳ھ) نے الاستیعاب فی معرفة الاصحاب لکھی، مصنف کا خیال تھا کہ اس میں ان تمام صحابہ کے حالات ہیں جن کا ذکر اس سے پہلے کی کتابوں میں آگیا ہے، لیکن ایسا نہیں ہے، بہت سے صحابہ کے حالات رہ گئے ہیں۔ اسی لیے بعد میں بہت سے علما نے اس کی تکمیل کی غرض سے اس کے ذیل لکھے جن میں ابن قحون اندلسی (۵۱۷ھ) کا ذیل مشہور ہے۔

۶۔ عزالدین ابن الاثیر (۶۳۰ھ) نے اسد الغابۃ فی معرفة الصحابہ لکھی، اس میں ۷۵۴ لوگوں کے حالات ہیں، اس میں صحابہ کے علاوہ بعض دوسرے راویوں کا ذکر بھی آگیا ہے۔

۷۔ حافظ شمس الدین ذہبی (۷۴۸ھ) نے اس سلسلے میں کئی کام کیے: (۱) تاریخ الاسلام و طبقات المشاہیر والاعلام (۲) تذکرۃ الحفاظ (۳) میزان الاعتدال پہلی اور دوسری کتابیں لوگوں کے حالات میں بڑی مستند

سمجھی جاتی ہیں۔ تیسری کتاب فن جرح و تصدیق کی اہم کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔

۸۔ شہاب الدین ابن حجر عسقلانی (۸۵۲ھ) نے متعدد کتابیں علم حدیث سے متعلق مرتب کیں۔ (۱) الاصابہ فی تمییز الصحابہ بڑی جامع اور مستند تصنیف ہے۔ اس میں ۹۴۷۷ صحابیوں اور ۱۵۴۵ اصحابیات کے حالات ملتے ہیں۔ (۲) میزان الاعتدال اس میں علامہ ذہبی کی میزان الاعتدال پر اضافے کیے ہیں (۳) تہذیب التہذیب یہ بھی مستند سمجھی جاتی ہے۔

۹۔ جلال الدین سیوطی (۹۱۱ھ) نے طبقات الحفاظ کے نام سے حافظ ذہبی کی تذکرۃ الحفاظ کی تلخیص کی اور کہیں کہیں اضافے بھی کیے۔ ان کا دوسرا اہم کام ابن حجر عسقلانی کی الاصابہ کی تلخیص بھی ہے جو عین الاصابہ کے نام سے مشہور ہے۔ ان کی تیسری ایک اور اہم تصنیف تہذیب الراوی ہے۔

۱۰۔ خطیب بغدادی (۴۶۳ھ) کا شمار حفاظ حدیث اور مؤرخین میں ہوتا ہے، انھوں نے حدیث کے سلسلے میں بہت سے اہم کام کیے ہیں۔ الکفایہ فی علم الروایۃ اس فن کی اہم کتاب بھی جاتی ہے۔

۱۱۔ محمد بن عبداللہ حاکم نیشاپوری (۴۰۵ھ) علم حدیث کے بڑے ماہر تھے ان کی "مستدرک" بہت مشہور ہے۔ انھوں نے



معرفۃ علوم الحدیث بھی لکھی ہے۔  
۱۲۔ عماد الدین ابوالفداء اسماعیل (۷۴۰ھ) ابن کثیر کے نام سے مشہور ہیں، اچھے حافظ، فقیہ اور مورخ تھے، اصول حدیث کے سلسلے میں ان کی اختصار علوم الحدیث بہت مشہور ہے۔

## اصطلاحات حدیث

بنیادی طور پر حدیث کی دو قسمیں ہیں :

(۱) مقبول : حدیث صحیح کو کہتے ہیں۔

(۲) مردود : حدیث ضعیف کو کہتے ہیں۔

لیکن محدثین نے تین قسمیں متعین کی ہیں جن کے تحت حدیث کی بے شمار قسمیں بنتی ہیں، جن کا تعلق حدیث کے راویوں اور متن دونوں سے ہے :

(۱) صحیح (۲) حسن (۳) ضعیف

یوں تو علمائے حدیث نے حدیث کی سو تک قسمیں بیان کی ہیں۔ ذیل میں اہم اصطلاحات و اقسام حدیث بیان کی جا رہی ہیں۔  
۱۔ حدیث : حدیث کے لغوی معنی بات یا گفتگو کے ہیں، لیکن

راوی ساقط نہ ہو۔

۱۳۔ منقطع : وہ حدیث جس کے سلسلہ روایت میں کوئی راوی ساقط ہو یا اس میں کسی مبہم راوی (جس کے حالات زیادہ نہ معلوم ہوں) کا ذکر کیا گیا ہو۔

۱۴۔ معضل : جس حدیث کے سلسلہ سند میں دو یا دو سے زیادہ راوی ایک ہی جگہ سے چھوٹ گئے ہوں۔

۱۵۔ معلق : جس حدیث کی سند کے شروع سے ایک یا متعدد راوی چھوڑ دیئے گئے ہوں یا پوری سند ہی بیان نہ کی گئی ہو۔

۱۶۔ درسل : جس حدیث میں تابعی صحابی کا نام نہ ملے اور حضور سے روایت کرے۔

۱۷۔ مضطرب : حدیث کی سند یا متن میں کمی زیادتی یا اہم و عہد اُلٹ پٹ گئے ہوں۔

۱۸۔ حدسج : اس کی دو قسمیں ہوتی ہیں پہلی وہ جس کی سند میں تفسیر و تبدل ہو اسے درج الاسناد کہتے ہیں۔ دوسری وہ جس کے متن میں راوی اپنا یا کسی اور کا کلام شامل کرے اسے درج المتن کہتے ہیں۔

۱۹۔ شاذ : وہ حدیث جس میں ثقہ راوی اپنے سے زیادہ ثقہ راوی کی مخالفت کرے۔

۲۰۔ محفوظ : وہ حدیث جس کا راوی ثقہ ہو لیکن اس کی مخالفت اس سے کم درجے کا ثقہ راوی کرتا ہو۔ (یعنی شاذ کا اُلٹا)

۲۱۔ منکم : وہ حدیث جس کا زیادہ ضعیف راوی کم ضعیف راوی

اصطلاح میں رسول اللہ صلیم کے اقوال و عمل اور تفسیر کو

حدیث کہتے ہیں۔

۲۔ صحابی : صحابی اُس شخص کو کہتے ہیں جس نے یہ حالت ایمان رسول اللہ صلیم سے ملاقات کی ہو اور ایمان ہی کی حالت میں اس کا انتقال ہوا ہو۔

۳۔ تابعی : وہ شخص جو ایمان کی حالت میں کسی صحابی سے ملا ہو اور ایمان ہی کی حالت میں انتقال ہوا ہو۔

۴۔ تبع تابعی : جس نے یہ حالت ایمان کسی تابعی سے ملاقات کی ہو اور ایمان ہی کی حالت میں اس کا انتقال ہوا ہو۔

۵۔ اثر : صحابہ کرام کے قول و عمل کو اثر کہا جاتا ہے۔

۶۔ سند : حدیث بیان کرنے والوں کے سلسلے کو سند کہتے ہیں۔

۷۔ متن : حدیث کی اصل عبارت کو متن کہتے ہیں۔

۸۔ حدیث قدسی : جس حدیث کو رسول اللہ صلیم نے اللہ تعالیٰ کی جانب منسوب کر کے بیان فرمایا ہو۔

۹۔ مرفوع : جس حدیث کی روایت کا سلسلہ رسول اللہ صلیم تک پہنچتا ہو، یعنی آپ کے قول و فعل یا تقریر کا ذکر ہو۔

۱۰۔ موقوف : جس حدیث کی روایت کا سلسلہ صحابی پر ختم ہوتا ہو، یعنی جس میں صحابہ کرام کے اقوال و افعال وغیرہ کا ذکر ہو۔

۱۱۔ مقطوع : جس حدیث کی روایت کا سلسلہ تابعی پر ختم ہوتا ہو، یعنی تابعی کے قول و فعل وغیرہ کا ذکر ہو۔

۱۲۔ متصل : جس حدیث کے سلسلہ روایت یعنی سند میں کوئی

ہی قسم کے الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہو۔  
(۲) متواتر معنوی : اس میں حدیث کے الفاظ کا یکساں ہونا شرط نہیں ہے بلکہ مفہوم ایک ہی ہونا چاہیے۔

۲۹۔ مشہور : وہ حدیث جس کے راوی کسی بھی دور میں تین سے کم نہ ہوں۔  
۳۰۔ عزیز : وہ حدیث جس کے راوی ہر دور میں دو سے کم نہ ہوں۔

۳۱۔ غریب : وہ حدیث جس کے سلسلہ روایت میں کسی دور میں ایک ہی راوی ہو۔

۳۲۔ مقبول : ایسی حدیث جسے ائمہ حدیث نے ہر اعتبار سے قابل حجت تسلیم کیا ہو۔

۳۳۔ مردود : وہ حدیث جسے ائمہ حدیث نے قابل حجت نہ مانا ہو۔

۳۴۔ حدیث : راوی جس سے روایت کرے اس سے ملا تو ہو مگر جو حدیث بیان کر رہا ہو، وہ براہ راست اس سے نہ سنی ہو لیکن الفاظ ایسے استعمال کرے جس سے شبہ ہو کہ اس نے براہ راست سنا ہے۔

۳۵۔ معلل : اس حدیث کو کہتے ہیں جس میں کسی ایسی علت کا پتا چلے جس سے حدیث میں قدرج وارد ہوتی ہو۔

۳۶۔ مقلوب : اس حدیث کو کہتے ہیں جس میں کسی راوی سے

کی مخالفت کرتا ہو۔  
۲۲۔ محروف : وہ حدیث جس میں کم ضعیف راوی زیادہ ضعیف راوی کی مخالفت کرے۔

۲۳۔ صحیح : وہ حدیث جس کی سند متصل ہو جس کے راوی عادل اور قابل اعتماد ہوں، راوی کا حافظہ اور ذہن اچھا ہو، غیر شاذ اور غیر معلل ہو۔

۲۴۔ حسن : وہ روایت جس میں صحیح کی تمام شرائط پوری ہوں سوائے حافظہ یا ضبط کے لیکن اس کی تائید دوسری روایت سے ہوتی ہو۔

۲۵۔ ضعیف : ایسی حدیث جس میں صحیح حدیث کی تمام یا بعض شرائط پوری نہ ہوتی ہوں۔

۲۶۔ موضوع : وہ حدیث جو کسی راوی نے اپنی طرف سے بنائی ہو، یا جس کے سلسلہ روایت میں کوئی ایسا راوی ہو جس کے بارے میں حدیث کا وضع کرنا ثابت ہو۔

۲۷۔ متروک : جس حدیث کی سند میں کوئی راوی تھوڑا ہو یا اس کے کسی قول و فعل کی وجہ سے اس پر فسق کا الزام قائم ہو یا ہو۔

۲۸۔ متواتر : وہ حدیث جس کے راوی ہر دور میں اتنی بڑی تعداد میں پائے جاتے ہوں کہ ان سب کا جھوٹ پرستش ہونا ممکن نہ ہو۔ اس کی دو قسمیں کی جاتی ہیں :

(۱) متواتر لفظی : وہ حدیث جس کو تمام راویوں نے ایک

اصل متن کا کوئی لفظ یا سند میں کسی راوی کا نام بدل گیا ہو یا مقدم موخر ہو۔ قلب سند اور متن دونوں میں پایا جاتا ہو۔  
۳۷۔ متعنعن: اس روایت کو کہتے ہیں جس میں "فلان عن فلان" کے الفاظ سے روایت کی گئی ہو۔  
۳۸۔ مسلسل: وہ حدیث جس کی سند متصل ہو، اس میں تدلیس نہ ہو، اور کسی ایک خاص عبارت یا فعل کی تکرار ہو، یعنی تمام راوی کسی صفت، حالت یا کیفیت کے بیان کرنے میں یکساں ہوں۔

۳۹۔ سند عالی: وہ حدیث جس کے راوی قلت تعداد کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب تر ہوں اور اسی حدیث کی کسی دوسری سند میں راویوں کی تعداد اس سے زیادہ ہو۔

## امام ابو حنیفہ

ولادت ۸۰ھ - وفات ۱۵۰ھ

ان کا نام نعمان کنیت ابو حنیفہ اور لقب امام اعظم ہے ان کی پیدائش کوفہ کے ایک متمول گھرانے میں ۸۰ھ میں ہوئی۔ ان کا سلسلہ نسب یوں بیان کیا جاتا ہے۔ نعمان بن ثابت بن نعمان بن مرزبان۔ بعض لوگوں نے آپ کے دادا کا نام زوطی لکھا ہے جو بنی تیم کے غلام تھے۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے کیونکہ خطیب بغدادی نے امام صاحب کے پوتے اسماعیل کی یہ روایت نقل کی ہے کہ ہم اہل فارس ہیں اور ہمیشہ سے آزاد ہیں۔ ہمارے خاندان میں کبھی غلامی نہیں آئی۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ آپ کے دادا کا نام سلام لانے سے پہلے زوطی تھا لیکن جب مسلمان ہو گئے تو ان کا نام نعمان رکھا گیا۔ اسماعیل ہی کی یہ روایت بھی ہے کہ جب امام صاحب کے والد پیدا ہوئے تو ان کے والد ان کو حضرت علیؓ کے پاس لے

گئے حضرت علیؑ نے ان کے حق میں دُعا کی یہ

بہر حال اس پر سب متفق ہیں کہ امام صاحب بھی اہل نسل تھے، امام صاحب کے والد ثنابت کے حالات زندگی کا ٹھیک سے پتا نہیں چلتا، لوگوں کا خیال ہے کہ تجارت ان کا پیشہ تھا۔ امام صاحب کی پیدائش کے وقت چند صحابہ موجود تھے۔ انس بن مالکؓ رسول اکرم صلیع کے خاص خادم تھے، ان کا انتقال ۹۳ھ میں ہوا۔ سہل بن سعدؓ نے ۹۱ھ میں وفات پائی، ابو طفیل عام بن دائدؓ ۱۰۰ھ تک زندہ رہے۔ چونکہ امام صاحب نے بعض صحابیوں کو دیکھا تھا۔ خاص طور سے حضرت انسؓ کو کئی بار دیکھا تھا اسی وجہ سے امام صاحب کو تابعین میں شمار کیا جاتا ہے لیکن یہ مسئلہ اختلافی ہے کہ امام صاحب نے ان صحابیوں سے حدیث کیوں نہیں روایت کی۔ جو لوگ امام صاحب کے زیادہ طرفدار ہیں۔ انھوں نے کچھ حدیثیں ایسی جمع کی ہیں جو امام صاحب نے صحابہ سے روایت کی ہیں لیکن یہ حدیثیں عام طور سے بہت ضعیف ہیں۔ صحابہ سے روایت نہ کرنے کی وجہ بعض لوگوں نے یہ لکھی ہے، جو قرین قیاس بھی ہے کہ امام صاحب زمانے کے دستور کے مطابق اپنے والد کے ساتھ تجارت میں لگ گئے تھے لیکن امام شعبی کے توجہ دلائے پر علم حدیث کی طرف متوجہ ہوئے اس وقت صحابہ میں سے کوئی بھی باقی نہ تھا۔

آپ کی کنیت ابو حنیفہ آپ کے نام سے زیادہ مشہور ہے، حنیفہ

امام صاحب کی کس اولاد کا نام نہ تھا، بلکہ یہ کنیت وصفی اور مخفی ہے جس کا مطلب ہے باطل کو چھوڑ کر حق کو اختیار کرنے والا۔ بعض لوگوں نے امام صاحب کی پیدائش کے سلسلے میں رسول اللہ صلیع کی بشارت کا ذکر کیا ہے، مگر وہ حدیث صحیح نہیں ہیں۔ یحییٰ ہی سے امام صاحب اپنے والد کے ساتھ تجارت میں لگ گئے، تعلیم ضروری قسم کی حاصل کر لی تھی۔ ایک روز تجارت ہی کے کام سے کسی سوداگر کے پاس جا رہے تھے، راستے میں امام شعبی کا مکان تھا امام شعبی اس وقت کوفہ کے اہم عالم اور امام تھے۔ ان کی نظر ابو حنیفہ پر پڑی تو ان کو اپنے پاس بلایا اور علما کی مجلسوں میں بیٹھنے کی تاکید کی اور یہ بھی کہا کہ مجھے تمھارے چہرے پر علم و فضل کے جوہر نظر آ رہے ہیں۔

امام شعبی کی اس گفتگو نے امام ابو حنیفہ پر بہت اثر کیا اور انھوں نے علما کی مجلسوں میں شرکت اور حصول علم کی طرف پوری توجہ کی۔ شروع میں آپ کی توجہ علم کلام کی طرف زیادہ تھی اور اس میں جلد ہی کمال حاصل کر لیا، مختلف فلسفیانہ مگردہوں سے مستutzer، انھیں اور گفتگو کی۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد ان کو خیال آیا کہ یہ سب بہت مناسب نہیں ہے، اس لیے کہ اگر پر علم ضروری رہا ہو تو صحابہ کرام نے جو دین کو زیادہ بہتر طریقے پر سمجھتے تھے ضرور ایسی باتوں میں حصہ لیا ہوتا۔ انھوں نے تو صرف فقہی اور دینی مسائل

جب تک امام حماد زندہ ہیں ان کی شگردی نہ چھوڑیں گے۔  
 امام حماد کے علاوہ ان کے اور بھی بہت سے اساتذہ تھے، جن میں سے مشہور یہ تھے، امام شعبی، عطاء بن رباح، علقمہ بن مرثد، حکم بن عتبہ، سلم بن کہیل، علی بن احمد، سعید بن مسروق ثوری، عدی بن ثابت، یحییٰ بن سعید انصاری، ہشام بن عروہ، نافع، قتادہ ابواسحق اور عمر بن دینار وغیرہ۔ بہت سے لوگوں نے ان کے اساتذہ کی تعداد سیکڑوں سے بھی اوپر شمار کی ہے۔ اسی طرح سے ان کے شاگردوں کی تعداد کا بھی صحیح طور پر اندازہ نہیں لگایا جاسکتا، لیکن ان کے تین شگرد امام محمد، امام ابو یوسف اور امام زفر غیر معمولی طور پر مشہور ہوئے اور امام صاحب کی فقہ کو، جو فقہ حنفی کے نام سے مشہور ہے، پھیلانے اور اس کا سکہ بٹھانے میں پیش پیش رہے۔ یہ انھیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج فقہ حنفی مسلمانوں کے بہت بڑے طبقے میں رائج ہے۔

امام صاحب جس طرح سے علم و فضل میں بے مثل تھے اسی طرح سے اخلاق و کردار میں بھی ان کا جواب نہ تھا۔ تذکروں اور تاریخ کی کتابوں میں بہت سے واقعات کا ذکر ملتا ہے، ایک مرتبہ بارون رشید نے امام ابو یوسف سے ابو حنیفہ کے اوصاف پوچھے تو انھوں نے بیان کیا کہ:

”امام محارم سے اجتناب کرتے تھے، بغیر علم کے

کی طرف توجہ دی اور اسی کو بہتر طریقہ پر لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ اس خیال کے آتے ہی انھوں نے کلامی علوم کو چھوڑ کر فقہی مسائل کی طرف توجہ کی اور امام حماد (م ۱۳۲ھ) کی مجلس میں حاضر ہو کر شرعی علوم کی تعلیم حاصل کی۔

حماد کو فقہ کے مشہور امام اور عالم تھے۔ انھوں نے حضرت انسؓ سے حدیث سنی تھی، امام ابو حنیفہؒ چونکہ بہت ذہین اور اچھے حافظ کے مالک تھے اس لیے بہت جلد استاد کے عزیز ترین شاگرد بن گئے اور یہ تعلق اتنا بڑھ گیا کہ جب استاد کو سفر پر جانا پڑتا تو لائق شاگرد کی یاد بے چین رکھتی اور کہتے کہ اگر مجھے قدرت ہوتی کہ میں ابو حنیفہ سے ایک لمحے کے لیے بھی اپنی نظر جدا نہ کروں تو نہ کرتا۔

اسی زمانے کا ایک اور واقعہ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ کچھ عرصے تک امام حماد کے درس میں رہنے کے بعد ان کو یہ خیال ہوا کہ اپنا حلقہ درس شروع کرں لیکن استاد کا ادب مانع ہوا تھا، اتفاق سے امام حماد کو بصرہ جانا پڑا، چلتے وقت وہ امام ابو حنیفہ کو اپنا جانشین بنا گئے۔ استاد کی عدم موجودگی میں انھوں نے مسائل میں فتوے دیے۔ جب امام حماد واپس آئے تو انھوں نے وہ مسائل اور اپنے فتوے ان کے سامنے پیش کیے۔ امام حماد نے ان میں سے میں میں غلطیاں نکالیں۔ امام ابو حنیفہ کو ان کی عظمت کا احساس ہوا اور قسم کھائی کہ

لے امام عظیم اور علم حدیث ۱۱۵

لے امام عظیم اور علم حدیث ۱۱۵

بڑھ گئی۔ آپ پریشان ہو گئے کہ میں کیسے صاف کروں، اس لیے کہ اگر صاف کرتے ہیں تو دیوار کی مٹی بھی بھڑے گی اور اگر اسی طرح بھڑ دیں تو دیوار خراب رہے گی۔ آپ اسی پریشانی میں مبتلا تھے کہ مالک مکان آگیا، وہ یہودی تھا اور اتفاق سے آپ کا مقروض تھا بھکا کہ آپ قرض وصول کرنے آئے ہیں اس لیے دیکھتے ہی معذرت کرنے لگا۔ آپ نے کہا کہ اس وقت میں قرض کے سلسلے میں نہیں بلکہ بھکاری دیوار کی وجہ سے پریشان ہوں اگرچہ صاف کرتا ہوں تو دیوار کی مٹی بھڑے گی اور میں گنہگار ہوں گا، نہ صاف کروں تو دیوار خراب رہے گی۔ اس بات کا یہودی پر اتنا اثر ہوا کہ فوراً ہی کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔

امام صاحب کو پیشہ تجارت ورثے میں ملا تھا، کپڑوں کی تجارت بہت وسیع پیمانے پر ہوتی تھی، مختلف شہروں میں ان کے نمائندہ کپڑوں کے تھان فروخت کرنے کے لیے جاتے تھے، ایک مرتبہ جب امام صاحب نے تھان باہر بھیجے تو کہلایا کہ فلان تھان میں عیب ہے اسے فروخت کرتے وقت خریدار کو اس عیب سے مطلع کر دیا جائے، اتفاق سے بیچنے والے کے ذہن سے یہ بات نکل گئی، اور عیب کے بارے میں خریدار کو نہ بتا سکا۔ جب امام صاحب کو معلوم ہوا تو بہت افسوس کیا اور تمام تھانوں کی رقم جو تیس ہزار درہم ہوتی تھی صدقہ کر دیا۔ ان کے اخلاق اور حسن سلوک کے ذکر سے ان کے تمام تذکرے پھرنے پڑے ہیں اور لوگوں نے بے شمار واقعات بیان کیے ہیں جو ان کے

دین کے سلسلے میں کوئی بات نہ کہتے تھے، اللہ کی عبادت میں مجاہدہ کرتے تھے، اہل دنیا کے منہ پر کبھی ان کی تعریف نہ کرتے تھے۔ مسائل دینیہ میں خاموشی اور سکون کے ساتھ غور کرتے، عظیم عالم ہونے کے باوجود سادگی پسند اور عسکر المزاج تھے، سوال کا جواب دیتے وقت کتاب و سنت کو سامنے رکھتے، اس میں جواب نہ ملتا تو قیاس کرتے۔ کسی کا ذکر کرتے وقت اس کی بھلائیوں پر نظر رکھتے، اگر کسی کو کچھ دیتے اور وہ ممنون ہوتا تو ان کو افسوس ہوتا اور کہتے کہ شکر کا مستحق تو صرف اللہ ہے۔

ایک صاحب کا اور بیان ہے کہ امام صاحب ایک روز بازار میں جا رہے تھے، ایک شخص آپ کو دیکھ کر چھپ گیا، آپ نے اس کو بلا کر چھینے کی وجہ پوچھی۔ اس نے جواب دیا کہ میں آپ کا دس ہزار درہم کا مقروض ہوں، کافی عرصہ ہو گیا لیکن ادا نہیں کر سکا، آپ سے شرم آتی ہے اس لیے چھپ گیا۔ اس کی گفتگو کا آپ کے دل پر بہت اثر ہوا اور فرمایا کہ میں خدا کو گواہ کر کے تمہارا قرض معاف کرتا ہوں۔ امام رازی نے لکھا ہے کہ امام صاحب کہیں جا رہے تھے، راستے میں کچھ تھکی، آپ کے پیر کی ٹٹو کر سے کچھ سامنے کے مکان کی دیوار پر

حضرت عمر فرمایا کرتے تھے کہ قیامت کے دن اگر مجھ سے مواخذہ ہوئے  
انعام ملے تو میں بالکل راضی ہوں گا۔

دوسروں سے ہمدردی اور خدمت کا جذبہ اپنی دولت و ثروت  
کے باوجود ان کی رگ رگ میں سمایا ہوا تھا۔ ایک بزرگ ابراہیم بن  
عقہ کسی کے چار ہزار درہم کے مقروض تھے، شرمندگی کی وجہ سے لوگوں  
سے ملنا جلنا چھوڑ دیا تھا۔ ان کے کسی دوست نے قرض ادا کرنے کے  
لیے چندہ جمع کرنا چاہا، جب امام صاحب کو خبر ہوئی تو سارا قرض ادا  
کر دیا اور فرمایا اتنی سی رقم کے لیے لوگوں کو کیوں زحمت دیتے ہو۔  
طبیعت میں تواضع اور مزاج میں بے حد نرمی تھی، نہ کسی سے  
انتقام لیا نہ کسی پر لعنت بھیجی، نہ بُرا بھلا کہا اور نہ ہی کسی سے فریب  
اور بد عہدی کی۔ لوگوں کی سخت کلامی اور بد گوئی کا جواب بھی نرمی اور  
حلم سے دیتے اور غصہ و درگزر سے کام لیتے۔ ایک بار ایک شخص نے  
ان سے بدتمیزی سے گفتگو کی، امام صاحب نرمی سے جواب دیتے  
رہے یہاں تک کہ اس نے امام صاحب کو زمین پر کہا، امام صاحب  
نے جواب دیا خدا تمہاری مغفرت کرے، وہ جانتا ہے کہ میری نسبت  
تم نے جو لفظ کہا درست نہیں ہے۔ ایک مرتبہ مسجد میں درس دے  
رہے تھے ان کے ایک دشمن نے وہیں ان کو بُرا بھلا کہنا شروع  
کر دیا، امام صاحب نے کوئی توجہ نہ کی اور اپنے شاگردوں کو بھی روک  
دیا۔ جب امام صاحب گھر واپس ہونے لگے تو وہ بھی ساتھ ساتھ

گردار اور سیرت کی تابناکی کو نمایاں کرتے ہیں۔  
عبادت و ریاضت ان کا محبوب مشغلہ تھا، بڑے ذوق و شوق  
اور شوق و خضوع سے اس میں لگے رہتے تھے، اکثر رات رات بھر  
عبادت میں گزار دیتے، برسوں عشاء کے وضو سے فجر کی نماز ادا کی، نماز  
یا قرآن پڑھتے وقت رقت طاری ہوتی اور خشیت الہی سے دہریک  
روتے رہتے۔ اکثر ایسا معلوم ہوتا کہ کسی آیت کو پڑھ کر ایک خاص  
کیفیت طاری ہوتی اور بار بار اسی آیت کو دہراتے رہتے اور روتے  
رہتے۔ ایک بار فجر کی نماز میں شریک جماعت تھے، امام نے  
ولا تحبن الله، غافلا عاقل النظمون الآیۃ پڑھی۔ امام ابو  
حنیفہ پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوئی اور ان کا بدن کانپنے لگا۔  
اسی طرح سے ایک بار عشاء کی نماز میں امام نے اذنا نزلت  
پڑھی، امام صاحب پر رقت طاری ہوگئی اور ساری رات اسی کیفیت  
میں مسجد میں رہے۔

ایک بار بازار جارہے تھے راستے میں کسی لڑکے کے پاؤ  
پر پاؤ بڑ گیا۔ وہ چیخ پڑا، امام صاحب کو اس کی چیخ سن کر غصہ  
آگیا، پوش میں آئے تو لوگوں نے اتنی سی بات پر بے قرار ہو جانے  
کی وجہ پوچھی تو جواب دیا ممکن ہے اس کی آواز ہدایت نبی ہو۔ ایک  
مرتبہ دکان پر گئے تو نوکر نے کپڑے بچال کر رکھے اور بولا خدا ہم کو  
جنت دے۔ یہ سن کر امام صاحب زانو تظار روئے گئے اور چہرے  
پر رومال ڈال کر چلے گئے۔ دوسرے دن نوکر سے کہا کہ ہم اس قابل  
کہاں کہ جنت کی آرزو کریں، یہی بہت ہے کہ عذاب سے بچ جائیں۔



نے ان سے درخواست کی اس جگہ کو پر کریں اور ان کے حلقہ درس کو جاری رکھیں۔ امام صاحب نے لوگوں کے اصرار سے مجبور ہو کر یہ ذمے داری قبول کر لی، رفتہ رفتہ ان کے حلقے کی شہرت ہو گئی اور بے شمار لوگ ان کے درس میں شریک ہونے لگے۔

نوامید کا دور امام صاحب کے لیے اچھا گزرا، لیکن عباسی دور میں سیاسی شورشیں ابھرنے لگیں، امام صاحب کا نام بھی ان میں ملوث تھا۔ خلیفہ منصور کو شبہ تھا کہ امام صاحب اس کے مخالفین میں ہیں اس لیے وہ ان سے خوش اور مطمئن تھا اور کسی ایسے موقع کی تلاش میں رہتا تھا کہ ان کو نقصان پہنچا سکے۔ اس نے ان کو قضا کا عہدہ پیش کیا۔ امام صاحب نے اس سے انکار کر دیا، منصور کو یہ بات پسند نہ آئی اور آپ کو قید کر دیا۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ قید کی حالت میں آپ کو کوڑے لگائے جاتے تھے جس سے آپ کا انتقال ہوا۔ اور بعض نے لکھا ہے کہ قید کے زمانے میں بھی آپ کا سلسلہ درس قائم تھا، اور منصور یہ سمجھتا تھا کہ ان کو اس طرح سے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا اس لیے ان کو زہر دلوادیا۔ جب امام صاحب زہر کے اثر کو محسوس کیا تو سجدہ کیا اور اسی حالت میں ۵۰ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ انتقال کی خبر ملتے ہی بے شمار لوگ جمع ہو گئے۔ نماز جنازہ میں پچاس ہزار کا مجمع تھا اور آنے والوں کا سلسلہ برابر جاری تھا، مورخین نے لکھا ہے کہ کچھ بار نماز جنازہ ادا کی گئی۔ میت کے مطابق خیزران کے مقبرے میں آپ کو دفن کیا گیا، دفن کے بعد بھی لوگ کئی ہفتوں تک ان کے جنازے کی نماز پڑھتے رہے۔ ان کے انتقال کی جس کو خبر ملتی افسوس کرتا، روتا اور علم دفع کے

جل دیا اور راستے بھر اسی طرح کہتا رہا، جب امام صاحب گھر کے قریب پہنچ گئے تو بولے بھی میرا گھر آ گیا ہے کچھ باقی رہ گیا ہو تو اٹھا نہ رکھو اس لیے کہ اب میں اندر جاتا ہوں اور پھر تم کو موقع نہ ملے گا۔

امام صاحب کے بڑوں میں ایک موچی رہتا تھا، دن بھر کی مزدوری کے بعد رات کو اپنے دوستوں کو جمع کر کے شراب و کباب میں مست رہتا اور گانا بجاتا۔ اس ہنگامے سے امام صاحب کو تکلیف ہوتی مگر اخلاق کی وجہ سے کچھ نہ کہتے۔ ایک رات کو تو ال نے اسے گرفتار کر کے جیل بھیج دیا۔ امام صاحب کو رات کو اس کی آواز سنائی نہ دی تو صبح کچھ لوگوں سے سبب پوچھا۔ جب انھیں اس کی گرفتاری کا حال معلوم ہوا تو خود کو تو ال کے پاس گئے اور اسے رہا کرالائے۔

امام صاحب کی ذہانت و طبعی کا ان کے ہم عصروں نے لوہا مانا ہے، اکثر بڑے اہم مسائل اپنی حاضر جوابی اور حاضر دماغی سے فوراً ہی حل کر دیا کرتے تھے۔ علامہ ذہبی نے بھی ان کو اذکیار بنی آدم میں شمار کیا ہے۔ ان کی اس خوبی کا ذکر تمام تذکرہ نگاروں نے کیا ہے اور بہت سے واقعات مثال میں لکھے ہیں۔

امام صاحب نے اپنے استاد و حاد کی زندگی میں ہی علم و فضل میں کمال حاصل کر لیا تھا، اُن کے انتقال کے بعد لوگوں

نور کے اٹھ جانے پر آنسو بہاتا۔

عام طور سے امام ابو حنیفہ کی شہرت و عظمت ان کے فقہ کی وجہ سے ہے، لیکن ائمہ حدیث نے ان کے علم حدیث کا بھی اعتراف کیا ہے اور ان کو اس فن کا بھی امام مانا ہے۔ اس لیے کہ مردن فقہ کے لیے عالم حدیث ہونا ضروری ہے، کیوں کہ مسائل کا استنباط قرآن و حدیث اور رجال کے مکمل علم کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس زمانہ حدیث کی درس و تدریس دو طرح سے ہوتی تھی، ایک تو وہ جس میں حدیث کی تلاش جستجو اور راویوں کی حیا بن ہوتی تھی، دوسرا طریقہ حدیث سے استنباط اور تحقیق مسائل کا تھا۔ پہلی قسم کے لوگوں کو محدثین اور اہل الروایہ کہا جاتا تھا۔ دوسرے طبقے کے لوگ اہل الراجحہ یا مجتہد کہلاتے تھے۔ چونکہ امام صاحب کا زیادہ تر کام دوسری نوعیت کا تھا اس لیے اسی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ علامہ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ فن حدیث میں امام ابو حنیفہ کا کبار مجتہدین میں ہونا اس سے ثابت ہے کہ ان کا مذہب محدثین میں معتبر خیال کیا جاتا ہے۔ علامہ ذہبی نے بھی امام صاحب کو حفاظ حدیث میں شمار کیا ہے۔ امام صاحب کے زمانے تک فن حدیث ایک مستقل فن کی صورت میں مرتب ہو گیا تھا، لیکن محدثین کا زیادہ زور روایت پر تھا، امام صاحب نے احادیث کی جانچ پڑال کے لیے روایت کے ساتھ روایت کے اصولوں سے کام لیا، اگرچہ اس کا رواج صحابہ کے زمانے سے ہی

ہو گیا تھا مگر امام صاحب نے ان سے بہت وسیع پیمانے پر کام لیا۔ اس اصول کی بنیاد اس پر تھی کہ اگر کوئی واقعہ یا بات قرین عقل نہ ہو، حالت، زمانہ اور طبیعت انسانی کے خلاف ہو تو اس کی صحت مشتبہ ہوگی۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے اصول مرتب کیے اور اس فن کی ترویج کی۔ بہر حال امام صاحب جس طرح سے فقہ کے امام تھے اسی طرح سے ان کو حدیث کا بھی امام تسلیم کیا جاتا ہے۔

امام ابو حنیفہ نے جہاں ایک طرف علم کلام کی بنیاد ڈالی اور فقہ کو مدون کیا وہیں انھوں نے کتاب الآثار مرتب کر کے حدیث کی بہت سی خدمت کی۔ اس کتاب میں انھوں نے احکام دانی احادیث کو ابواب فقہیہ کے تحت جمع کیا۔ احادیث صحیحہ کی سب سے قدیم کتاب ہی سمجھی جاتی ہے۔ اس سے پہلے حدیث نبوی کے جو مصنف تھے وہ اسی فن کے حساب سے نہ تھے، بلکہ ان کے جامعین۔ جب اور جہاں حدیث یاد آتی یا مل گئی کچھ دی۔ امام شیبی نے بھی تجویب کی پوشش کی تھی مگر اس کا سلسلہ چند ابواب سے آگے نہ بڑھ سکا تھا۔ بہر حال امام ابو حنیفہ نے اس کام کو خوش اسلوبی سے پایہ تکمیل کو پہنچایا اور بعد کے لوگوں کے لیے ایک نئی راہ ہموار کی ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ موطا سے پہلے احادیث صحیحہ کی کوئی کتاب مدون نہیں کی گئی تھی، یہ بات درست نہیں ہے۔ امام ابو حنیفہ کی کتاب الآثار موطا امام مالک سے پہلے کی تصنیف ہے۔ اور

شیخانی، امام حسن بن زیاد نے الگ الگ روایت کی اور ان سے ان کے شاگردوں نے۔ ان نسخوں کو بعض علماء نے مسند کہا ہے، بعض نے سنن، لیکن اصل نام کتاب الآثار ہی ہے۔ مولانا عبدالرشید نعمانی نے اپنی کتاب ابن ماجہ اور علم حدیث میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔

امام ابو حنیفہ کی تصانیف سے امام مالک کے استفادے کا ذکر تلامذہ کی کتبوں میں صراحت کے ساتھ موجود ہے۔ کتاب الآثار کی روایات مؤطا کی روایات سے صحت میں کسی طرح سے کم نہیں ہیں۔ اسناد روایات کے اعتبار سے اس کے درجے کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اسے چالیس ہزار احادیث کے مجموعے سے منتخب کیا تھا۔ امام ابو حنیفہ کی اعتیاد کا بڑے بڑے محدثین نے اعتراف کیا ہے۔ انھوں نے کوفہ، بصرہ اور حجاز کی درس گاہوں میں ایک مدت تک علم حدیث حاصل کیا تھا، کتاب الآثار میں امام صاحب نے صرف ان احادیث کو شامل کیا ہے جن سے مسائل فقہیہ کا استنباط ہوتا ہے۔ اس کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بیان کی گئی روایات کسی ایک شہر یا علاقے تک محدود نہیں ہیں بلکہ اس میں مکہ، مدینہ، کوفہ، بصرہ، حجاز و عراق وغیرہ کے محدثین کی بیان کردہ روایات بھی شامل ہیں۔ مسائل کے سلسلے میں اس میں حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عمرؓ، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت عائشہؓ کی روایات موجود ہیں۔ کتاب الآثار کو حنفیوں کی اہم کتب میں شمار کیا جاتا ہے یہ

کتاب الآثار کے متعدد نسخے امام ابو حنیفہؒ کے شاگردوں کی روایت سے پھیل گئے۔ مثلاً امام زعفران، امام ابو یوسف، امام محمد بن حسن

لے ملاحظہ ہو ابن ماجہ اور علم حدیث ص ۱۷۵ تا ۱۷۶ ابن ماجہ اور علم حدیث ص ۱۷۵ تا ۱۷۶ اس نسخے کا ذکر حافظ ابوسریہ ماکولا حنفی ص ۵۴، ۵۵ نے الاکمال (باقی اگلے صفحہ)

حافظ ابو حنیفہؒ میں کیا ہے۔ الاکمال کے قلمی نسخے کتب خانہ ریاست ٹونک اور خانہ آصفیہ حیدرآباد میں موجود ہیں۔ اس نسخے کا ذکر حافظ عبدالقادر قرشی نے الجواہر المفیدہ میں کیا ہے۔ اس نسخے کو ایک تلاش وخت سے حاصل کر کے مولانا ابوالوفا قدساری صدر مجلس اہیاء التراث العربیہ حیدرآباد نے ۱۳۵۵ھ میں مصر سے شائع کیا۔

اس نسخے کا ذکر حافظ ابن حجر عسقلانی نے تمام نسخوں میں سب سے مقبول و مشہور ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی اور حافظ قاسم بن قسطلانی نے اس کے رجال پر کتابیں لکھی ہیں۔ یہ نسخہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

ان کے نسخے کا ذکر حافظ ابن حجر عسقلانی نے لسان المیزان میں کیا ہے۔ کتاب الآثار تمام نسخوں میں یہ نسخہ سب سے بڑا ہے۔ اس میں چار ہزار روایات بیان کی گئی ہیں۔ اس نسخے کی شہرت مسند ابی حنیفہؒ میں زیادہ کے نام سے ہے۔ یہ نسخہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

# امام مالک

( ولادت ۵۹ھ - وفات ۱۷۹ھ )

امام مالک کا خاندان عرب میں جاہلیت اور اسلام دونوں میں ممتاز تھا، آباؤ اجداد میں تھے مگر رسالت مآب کی دعوت اسلام قبول کرنے کے بعد مدینہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ آپ کے دادا ابو عامر عبد بنوی میں مشرف بہ اسلام ہوئے تھے امام مالک کبار تابعین میں سے ہیں اور صحاح ستہ میں ان سے روایتیں مروی ہیں، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت عائشہؓ وغیرہ سے انھوں نے کسب فیض کیا تھا۔

امام مالک کا سلسلہ نسب یوں بیان کیا گیا ہے۔ مالک بن انس بن مالک بن ابی عامر بن عمر بن حارث بن غیمان بن جیشل بن عمر بن حارث ذی الصبح۔ یہ یمن کے آخری شاہی خاندان

حجر کی شاخ سے تھے بلکہ امام مالک کی تاریخ ولادت کچھ کے نزدیک ۹۳ھ ہے اور کچھ کے نزدیک ۹۵ھ۔ ہوش و خرد کی منزل میں قدم رکھتے ہی ان کے کان علم سے آشنا ہونے لگے۔ خود ان کا گھرانہ علم و فضل سے مالا مال تھا، گھر سے باہر شہر میں بڑے بڑے علماء و محدثین موجود تھے جو علوم شریعت کے نمائندے اور قرآن و سنت کے پاسبان تھے۔ مدینہ میں حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ، حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت عبد اللہ بن عباسؓ وغیرہ کے فیض یافتگان موجود تھے۔ ان صحابہ کرام کے تلامذہ قاسم بن محمد، عروہ بن زبیر، سعید بن مسیب، عبد اللہ بن دینار، مسلم بن شہاب زہری وغیرہ اسی شہر کے مشاہیر اور علم کے درخشاں ستارے تھے۔ یہیں سے فتاویٰ، احکام شرعیہ اور مسائل فقہیہ طے ہو کر لوگوں کے سامنے پہنچتے تھے۔

امام مالک نے اسی دینے میں آنکھ کھولی، اس وقت یہاں کے علما کا فیض جاری تھا، انھوں نے ان سے فائدہ اٹھایا اور جلد ہی اس دور کے تمام علوم کو بدرجہ کمال حاصل کر لیا۔ ان کے اساتذہ و شیوخ کی فہرست خاصی طویل ہے، ان میں حضرت نافعؓ، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے آزاد کردہ غلام، کا نام سرفہرست ہے۔ امام مالک نے ان سے پوری طرح استفادہ کیا، ان کا مشہور سلسلہ روایت مالک عن نافع عن ابن عمر کو شرف قبول حاصل ہے اور اسے

کا پتا چلتا ہے کہ ایمان داری، سچائی اور عبادت و ریاضت اپنی جگہ بے مثال چیزیں ہیں مگر جب تک عابد و زاہد میں علم و تفقہ نہ ہو وہ اچھا محدث، مفتی اور فقیہ نہیں ہو سکتا اور نہ اس کی بیان کی ہوئی حدیث کو حجت بنایا جاسکتا ہے۔ روایت حدیث میں ان کی احتیاط کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ بعض بزرگ جو اُس وقت زندہ تھے لیکن بہت بوڑھے ہو چکے تھے مثلاً ان کے دارا مالک بن ابی عامر، سالم بن عبد اللہ، سلیمان بن سیار وغیرہ سے انھوں نے بلا واسطہ کوئی حدیث نقل نہیں کی ہے اور اس کا سبب خود یہ بیان کیا ہے کہ میرے زمانے میں مدینے میں بعض ایسے اہم بزرگ موجود تھے جن کی عمریں سو سال سے متجاوز تھیں مگر میں نے ان سے روایت نہیں کی اس لیے کہ عمر کے ساتھ ساتھ عقل و حفظ میں بھی ضعف آجاتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ امام مالک جس شخص کی روایت لے لیتے تھے عام طور سے لوگ اسے صحیح تسلیم کر لیتے تھے۔

امام مالک کو اللہ تعالیٰ نے قوی حافظ بھی عطا کیا تھا، اکثر باتیں ایک بار سن کر ان کے حافظے میں محفوظ ہو جاتی تھیں، حافظے کے سلسلے میں ان کا یہ قصہ بہت مشہور ہے کہ ایک بار اپنے استاد ربیعہ کے ساتھ امام زہری کی مجلس میں حاضر ہوئے۔ اس دن امام زہری نے اہل مجلس کو چالیس حدیثیں لکھائیں، دوسرے دن جب پھر مجلس میں گئے تو امام زہری نے کہا کہ کل میں نے جو حدیثیں لکھائی تھیں وہ لاؤ تاکہ مجھے اندازہ ہو سکے کہ اس سے کیا

سلسلہ الذمب (سنہری زنجیر) کہا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ مدینے کے دوسرے شیوخ سے بھی انھوں نے کسب فیض کیا تھا، مدینے کے بزرگوں کے علاوہ شام، بصرہ، خراسان وغیرہ کے اساتذہ جو حج و زیارت کی غرض سے آیا کرتے تھے، ان سے بھی استفادہ کیا تھا۔ علم حدیث کے ساتھ ساتھ علم فقہ کی تعلیم بھی شیوخ سے حاصل کرتے تھے، اس سلسلے میں ابو عثمان ربیعہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ یہ اہم تابعین میں سے تھے اور حضرت انس نیز دوسرے صحابہ سے فیض اٹھایا تھا۔ ربیعہ اجتہاد و استنباط مسائل کے لیے مشہور تھے، ان کی نظر فقہی مباحث پر پوری طرح سے تھی، ان کا شمار ثقہ لوگوں میں ہوتا تھا، حدیث و فقہ دونوں میں ماہر تھے۔ امام مالک نے ان سے بہت فائدہ اٹھایا۔ امام مالک نے انھی اساتذہ کے آگے زانوئے تلمذتہ کیے جو واقعی علم و ارشاد کے اہل تھے، علم و عمل اور زہد و تقویٰ کے ساتھ صاحبِ رائے کے مالک بھی تھے۔ بعض کتبوں میں خود ان کا بیان ہے کہ مدینے میں ایسے لوگ تھے کہ اگر بارش کی دعا کرتے تو ان کی دعا کی برکت سے بارش ہوتی، لیکن میں نے ان سے استفادہ نہیں کیا اس لیے کہ یہ لوگ زہد و تقویٰ میں تو بے مثال تھے، لیکن حدیث و روایت اور فتویٰ کا کام محض زہد و تقویٰ سے نہیں چل سکتا اس کے لیے علم و فہم کی بھی ضرورت ہوتی ہے جس زہد کے ساتھ فہم و فراست اور دانائی نہ ہو وہ علم و فن کے لیے مفید نہیں ہے۔ اس کے علاوہ بھی ان کی دوسری روایات ایسی ملتی ہیں جن سے اس بات

کہ امام مالک کی مجلس درس کا آغاز ۱۱ھ میں ہوا تھا۔ کتابوں میں ان کی مجلس درس کا حال تفصیل سے لکھا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ ان کی مجلس میں صاف ستھرے فرش اور قالین بھی رہتے تھے، فرش پر ایک تنکا بھی نظر نہ آتا تھا۔ حدیث کے املا کے وقت امام صاحب وسط میں اونچی جگہ پر بیٹھتے تھے۔ درس کے وقت خوشبودار حبس لگائی جاتی تھیں۔ حدیث بیان کرنے سے قبل امام صاحب غسل یا وضو کرتے، اچھا لباس پہنتے اور خوشبو وغیرہ لگا کر مجلس میں تشریف لاتے۔ مجلس کے تمام شرکاء ادب کے ساتھ سر جھکا کر بیٹھتے، مجلس بر سکوت طاری رہتا، ان کے دروازے پر لوگوں کی بھیڑ رہتی تھی جس میں طلبہ، سیاح، امرا، علما اور عام لوگ بھی شامل ہوتے تھے۔ حدیث کا املا مجلس درس یا مسجد نبوی کے علاوہ کسی دوسری جگہ پر ہرگز نہ کراتے تھے۔ خلیفہ مہدی اور ہارون دونوں نے اپنے پاس ہاکر املا کی خواہش کی لیکن آپ تیار نہ ہوئے۔ جلدی میں، مصروفیت میں یا راہ چلتے ہوئے حدیث بیان کرنے کو غلاف ادب سمجھتے تھے، اس لیے کہ حدیث سننے اور سمجھنے کے لیے سکون و اطمینان ضروری ہے اور ایسے مواقع پر اس کا امکان نہیں ہوتا۔ مجلس میں باوازا بلند بولنا بھی ادب و تہذیب کے خلاف تھا۔

صبح کی نماز کے بعد آپ مصلیٰ پر طلوع آفتاب تک اور ادو وظائف میں مشغول رہتے۔ اس کے بعد لوگ آنے لگے، آپ ان

فائدہ پہنچا۔ ربیعہ نے کہا کہ اس مجلس میں ایک شخص ایسا ہے جو کل کی تمام حدیثوں کو زبانی سنا سکتا ہے، امام زہری نے پوچھا وہ کون ہے، ربیعہ نے امام مالک کی طرف اشارہ کیا اور امام مالک نے وہ تمام احادیث سنادیں۔ امام زہری کو بہت تعجب ہوا اور انھوں نے کہا کہ میرا خیال تھا کہ کسی کو بھی یہ حدیثیں یاد نہ ہوں گی۔ امام مالک کا دور طالب علمی غربت و افلاس میں گزرا، اکثر فقر و فاقہ کی نوبت رہتی تھی۔ بعض اوقات اپنے مکان کی چھت کی کڑیاں فروخت کر کے گزر اوقات کا انتظام کرتے لیکن اس کے باوجود طلب علم میں کمی نہ کرتے۔ خود کہتے تھے کہ کوئی شخص علم میں اس وقت تک کمال حاصل نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ مبتلائے فقر نہ ہو اور علم کو اس پر ترجیح نہ دی ہو۔

امام مالک کی لیاقت اور ان کے علم کی شہرت بہت تیزی سے بڑھ رہی تھی اور اپنے شیوخ کی موجودگی میں ہی ان کی اہمیت بڑھتی تھی لیکن جب ان کے استاد ربیعہ کی وفات ۱۳۶ھ میں ہوئی تو متفقہ طور پر ان کو حدیث و فقہ اور اجتہاد و رائے کا امام مان لیا گیا۔

فن حدیث میں امام مالک حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے عظیم نافعؓ کے خاص شاگرد تھے۔ نافعؓ حضرت ابن عمرؓ کے بعد ان کی مجلس کے جانشین ہوئے اور ۱۱۱ھ میں وفات پائی۔ امام مالک بارہ برس تک ان کے درس میں شریک ہوتے رہے۔ اور ان کی وفات کے بعد ان کے جانشین ہوئے، اس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے

اصل اور اس کی شرح و اضافہ کے مل جانے کا اندیشہ نہ رہتا تھا۔ ان کی مجلس درس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی تھی اور شام عراق، ترکستان، مصر، مالک ایشیا و افریقہ و اسپین سے طالبان علم بڑی تعداد میں ان سے فیض حاصل کرنے کے لیے مدینہ منورہ آتے تھے۔ ان کے شاگردوں اور ان لوگوں کی تعداد جنہوں نے ان سے روایت کیا ہے بے شمار ہے، اکثر وہ لوگ جن سے ابتدا میں خود امام صاحب نے فیض اٹھایا تھا آخر میں ان کے علم سے مستفید ہوئے۔ شاگردوں کی جتنی بڑی تعداد ہر طبقے اور مرتبے کے لوگوں کی (جن میں امرا، ائمہ صوفیا، فقہا، ارباب اور فلاسفہ وغیرہ بھی شامل ہیں) امام صاحب کو نصیب ہوئی وہ کسی دوسرے محدث یا فقیہ کو نہیں ہوئی۔ ان کے بہت سے شاگرد اونچے درجے کے محدث اور فقیہ شمار ہوئے، اصحاب ستہ کے مصنفین بھی صرف ایک واسطہ سے امام مالک کے حلقہ بگوشوں میں شامل ہیں اور اس پر ان لوگوں کو خیر و ناز ہے۔

امام مالک کی فقہ اور ان کے قادی کی بنیاد مرینے کی فقہ پر ہے، ان کے کمال اور فضل کا اعتراف نہ صرف مرینے کے تمام شیوخ کو تھا بلکہ دوسرے بلاد امصار کے لوگ بھی معترف تھے۔ حج کے زمانے میں جب تمام دنیا سے لوگ سٹ سٹ کر حرم میں جمع ہوتے اس وقت حکومت کی طرف سے یہ اعلان ہوتا کہ سوائے امام مالک

کی طرف متوجہ ہوتے، مجلس کی ترتیب میں اس بات کا خیال رکھا جاتا تھا کہ آپ کے قریب مستند وہن طلبہ بیٹھیں، پھر مرتبے کے لحاظ سے لوگ بیٹھتے جاتے تھے، مجلس کی یہ ترتیب خود آپ کی قائم کی ہوئی تھی۔ اہلبیت آہستہ آہستہ کراتے تاکہ نکلنے میں کسی سے غلطی نہ ہونے پائے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ طلبہ کی تعداد بہت بڑھ جاتی تھی، اس وقت امام کے املا کو مستل آئے تک پہنچانے تک جس طرح سے مکتبہ امام کی بکیروں کو دوسروں تک پہنچاتا ہے، درس کا ایک طریقہ یہ بھی ہوتا تھا کہ احادیث وغیرہ کو پہلے سے خود لکھ لیتے یا کسی ہونہار شاگرد یا کاتب کو لکھا دیتے۔ یہی اجزا مجلس میں پڑھے جاتے اور ان کے مطالب اور دوسرے مباحث کی تشریح کی جاتی تھی۔ عام طور سے امام صاحب اسی دوسرے طریقے کے پابند تھے اور اسی کو بہتر سمجھتے تھے۔ اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ اگر صرف یادداشت سے زبانی بولن ہو تو کبھی غفلت اور کبھی غصے سے گہرا کریساں میں تسامع ہو سکتا ہے، لیکن اگر کوئی چیز لکھی ہوئی سامنے موجود ہو تو ترتیب بھی بہتر ہوگی اور بیان کرتے وقت ذہن بھی منتشر نہ ہوگا اور پورے سکون و اطمینان کے ساتھ ضروری مسائل پر بحث اور ان کی تشریح ہو سکے گی۔ اس کے علاوہ خود پڑھ کر اس کی تشریح و بیان میں یہ اندیشہ بھی رہتا تھا کہ طلبہ متن و شرح میں ممکن ہے کسی وقت تمیز و تفریق نہ کر سکیں اور دونوں چیزیں ایک ساتھ نقل کر لیں۔ امام صاحب چونکہ دوسرے سے پڑھواتے اور خود اس کی تشریح کرتے اس لیے

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ فتوے بہت کم دیتے تھے، جواب ہمیشہ سوج بھجھ کر تلاش و جستجو کے بعد دیتے تھے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ ایک مسئلے کی چھان بین میں کھانا پینا اور نیند ترک کر دیا کرتے تھے۔ لوگوں نے کہا کبھی کہ حضرت آپ کی بات کو تو لوگ یوں بھی تسلیم کر لیتے ہیں، آپ اتنی مشقت کیوں اٹھاتے ہیں۔ جواب دیا کہ اس حال میں تو مجھے اور بھی کاوش کرنی چاہیے، تاکہ ان کے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہ پہنچے۔ اگر کبھی کسی مسئلے میں کوئی غلطی ہو جاتی اور اس کی اصلاح کی جاتی تو فوراً تسلیم کر لیتے۔ ان کے فتاویٰ کو ان کے شاگردوں نے جمع بھی کر دیا ہے، اس سلسلے میں پہلی کتاب اسد بن فرات قاضی انریقہ کی ہے جس کا نام اسد ہے۔ دوسری کتاب جو بہت ضخیم ہے ابن قاسم (۱۹۱ھ) کی ہے جس کا نام المدونہ ہے، کی تدوین امام صاحب کے سامنے ہی شروع ہوئی تھی، یہ کتاب مصر میں چھپ گئی ہے۔ تیسری ابن دہب مصری (۱۹۷ھ) کی کتاب المجالس عن مالک ہے۔

امام صاحب کا محدثین میں بھی اونچا درجہ ہے اور ان کو ارباب رائے میں شمار کیا گیا ہے، بڑے بڑے محدثین ان کی روایت کی ہوئی حدیثوں کو بے چون و چرا تسلیم کر لیتے ہیں، عبد الرحمن بن ہدی کا قول ہے، روئے زمین پر مالک سے بڑھ کر حدیث کا کوئی امانت دار نہیں۔ محدث ابن نہیک کا کہنا ہے کہ صحت حدیث پر میں مالک پر کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا۔ امام احمد بن حنبل سے کسی نے پوچھا کہ کوئی شخص کسی کی حدیث زبانی یاد کرنا چاہے تو

اور ابن ابی ذئب کے کوئی اور فتویٰ نہ دے۔ عام طور سے حکومت کی طرف سے جس کی تعظیم و تحکیم ہوتی ہے وہ مختلف فیہ مسائل میں حکومت ہی کی منشا کا ساتھ دیتا ہے، لیکن امام صاحب کی جلال شان یہ تھی کہ وہ حق کی طرف داری کرنے میں کسی قسم کی جانب داری یا رعایت سے کام نہ لیتے، خواہ اس میں ان کو کتنی ہی دشواری یا مصائب کا سامنا کرنا پڑتا۔ ایک خصوصیت ان کی یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ جب تک کسی مسئلے کی جزئیات و فروعات پر ان کی پوری نظر نہیں ہوتی تھی اس پر کوئی فتویٰ نہ دیتے تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص کسی دور دراز علاقے سے ان کی مجلس میں حاضر ہوا اور کوئی مسئلہ دریافت کیا۔ امام صاحب کے ذہن میں اس وقت وہ مسئلہ پوری طرح سے واضح نہ تھا اس لیے آپ نے فرمایا میں اسے اچھی طرح سے نہیں جانتا ہوں۔ اس شخص نے کہا کہ میں چھ ماہ کی راہ صرف اسی مسئلے کو معلوم کرنے کے لیے لے کر کے آیا ہوں، جن لوگوں نے مجھے بھیجا ہے میں انہیں کیا جواب دوں گا۔ آپ نے جواب دیا کہ کہہ دینا کہ مالک نے کہا ہے کہ میں جواب نہیں دے سکتا۔ امام صاحب کی یہ احتیاط دور والوں کے لیے زیادہ ہوتی تھی اس لیے کہ ان کا خیال تھا کہ مفتی کی رائے کسی مسئلے میں جو آج ہے کل وہ اپنے علم کی بنا پر بدل سکتی ہے اس لیے اگر کسی کو آج ایک فتویٰ دیا اور کل رائے بدلی تو اسے کس طرح مطلع کیا جائے گی؟



اسے جانوروں کے کھروں سے رونوٹوں، مدینہ منورہ سے محبت کا یہ عالم تھا کہ سوائے سفر حج کے وہاں سے باہر نہ جاتے تھے۔ خلیفہ منصور اور خلیفہ مہدی نے متعدد بار ان کو بغداد میں رہنے پر آمادہ کیا۔ سفر خرچ بھیجا مگر آپ راضی نہ ہوئے اور کہلاوا کہ مالک سے مدینہ نہیں چھوٹ سکتا۔ اس محبت کی انتہا یہ ہے کہ جہود اسلام کے خلاف کچھ منظمہ پر مدینہ منورہ کو فضیلت دیتے تھے۔

جو دو سخا ان کے مزاج کا خاصہ تھا۔ یہاں نوازی میں بے مثل تھے، یہاں کے لیے یزبانی کے فرایض خود انجام دیتے، کھانا خود لاتے اور وضو کے لیے پانی پیش کرتے۔ صبر و ضبط اور استقلال کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ موزہ پہن کر درس کے لیے چھ گئے، موزے میں بچھو تھا اس نے سترہ بار ڈنگ مارا چہرے کا رنگ برابر متغیر ہوتا تھا مگر آداب مجلس کے خیال سے درس کے اختتام تک اسی حال میں رہے اور درس ختم ہونے کے بعد ہی موزہ اتارا۔

امام مالک اپنی خودداری اور حق گوئی میں بھی بے باک تھے، ان کا خیال تھا کہ منصور کی بیعت خلافت جبری ہے اور جو کام جبراً کرایا جائے شرع میں اس کا اعتبار نہیں، حدیث میں ہے کہ اگر کسی سے جبراً طلاق دلائی جائے تو واقع نہ ہوگی۔ جعفر جب مدینہ

کس کی کرے جواب دیا کہ مالک بن انس کی۔ سفیان بن عیینہ اور سفیان ثوری بھی ان کے علم و فضل اور روایت حدیث کے قائل تھے۔ ابن عیینہ کہا کرتے تھے کہ مالک خدا کی طرف سے خلق پر حجت ہیں، یہ بھی کہتے تھے کہ ان سے بڑھ کر کوئی قابل اعتماد نہیں۔ امام حدیث یعنی بن سعید قطان فرماتے تھے کہ مالک اس امت کے لیے رحمت ہیں۔ ابن ابی حازم سے پوچھا گیا خدائے کبہ کی قسم مالک سے بڑا کوئی عالم تم نے دیکھا ہے، جواب دیا "خدا یا نہیں"۔ امام مالک کا شمار عباد و زہاد میں تھا، درس و تدریس اور انکار سے جو وقت بچتا تلاوت کلام، یک اور عبادت الہی میں صرف کرتے۔ ان کی بہن سے کسی نے ان کی گھریلو زندگی اور کاموں کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے کہا کہ "المصنف والتلاوة" اس کے علاوہ ان کی صاحبزادی اور بھانجے کا بیان ہے کہ جمعہ کی شب اور مہینے کی پہلی تاریخ کو عبادت و ریاضت ان کا دستور تھا۔ رسول اللہ صلی علیہ وسلم سے ان کو غیر معمولی محبت تھی۔ بڑے ادب و احترام سے ان کا نام لیتے، ایسے وقت چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا، مسجد نبوی میں سوار و غل کو بہت برا اور گستاخی سمجھتے تھے کہ حضور کی آرام گاہ ہے غسل یا وضو کے بغیر حدیث نبوی بیان نہ کرتے تھے۔

مدینہ منورہ میں سبھی سواری پر نہ نکلتے تھے۔ لوگوں نے وجہ پوچھی تو فرمایا مجھے شرم آتی ہے کہ جو سرزمین قدوم نبوی سے مشرف ہوئی ہو میں

لہستان المحدثین

لہ تذکرۃ المحدثین جوارہ اعلام علماء الاعلام

لہستان المحدثین

لہ حیات امام مالک

آخر عمر میں کمزوری و ناتوانی بڑھ گئی تھی، لیکن اس حالت میں جب تک ممکن ہوا درس و تدریس کا کام جاری رکھا۔ آخر میں حالت زیادہ بگڑ گئی اور مرض شدید ہو گیا، لوگوں کو اندازہ ہو گیا کہ وقت آخر ہے، لوگ آخری دیدار کے لیے آئے گئے۔ ۱۱ ربیع الاول ۱۱۱۵ھ کو ان کا انتقال ہو گیا، بے شمار لوگ جنازے میں شریک تھے۔ جنت البقیع میں دفن ہوئے۔

امام مالک نے متعدد دکن میں خود تصنیف کی ہیں یا ان کے شاگردوں نے ان کی مجلس درس میں سن کر مرتب کیں اور ان سے منسوب ہیں: ۱- مؤطا: کتاب الآثار کے بعد یہ حدیث کا دوسرا مجموعہ ہے جو امت مسلمہ کے پاس موجود ہے۔ اس کا تفصیلی ذکر آئندہ صفحات میں کیا جائے گا۔

۲- المدونہ: یہ امام مالک کے فقہی ملفوظات کا مجموعہ ہے جسے ان کے شاگرد ابن قاسم (۱۹۱ھ) نے ان کی زندگی ہی میں مرتب کر دیا تھا۔ بعض لوگ اسے امام صاحب کی تصنیف بھی کہتے ہیں یہ بڑی ضخیم کتاب ہے، مصر سے چھپ گئی ہے۔

۳- رسالہ مالک الی الرشید: خلیفہ ہارون الرشید کے خط ہے جس میں امام صاحب نے خلیفہ کو دینی و دنیاوی و اخلاقی نصیحتیں کی ہیں۔ بعض لوگوں نے اس میں بیان کی گئی احادیث کو

کا دلی بن کر آیا تو اس نے امام صاحب کے پاس کھلا بھیجا کہ آئندہ طلاق جبری کے عدم اعتبار کا فتویٰ نہ دیں اس نے لوگوں کو منصور کی جبری بیعت کے خلاف سند ملے گی لیکن امام صاحب پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اور برابر جبر کو غیر شرعی بات ہونے کا فتویٰ دیتے رہے۔ جعفر نے غصے میں ان کو کوڑے لگوائے، جیم ابو بہان ہو گیا، ایسی حالت میں جعفر کے حکم سے اونٹ پر چڑھا کر تیشہ و تازیانہ کی غصے سے شہر میں گھمایا گیا، لیکن اس حال میں بھی ان کے پائے ثبات کو نفرت نہ ہوئی۔ اور برابر اپنی رائے کا اعلان کرتے رہے۔ جب منصور کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو بہت تادم ہوا، امام صاحب کو معذرت کا خط لکھا اور جعفر کو فوراً معزول کر کے تحقیر و تذلیل کے ساتھ بندھا دیا۔

خلیفہ مہدی اور ہارون رشید نے بھی ان کی عزت و توقیر میں کمی نہ کی اور ان کے علمی مرتبے کو دوسروں پر ترجیح دیتے رہے۔ ایک بار مہدی نے اپنے بیٹوں کو سولی اور ہارون کو حکم دیا کہ امام صاحب سے مؤطائیں، انھوں نے امام صاحب کو بلا بھیجا۔ امام صاحب نے کھلا پا کر علم بیش قیمت شے ہے، شائقین خود اس کے پاس آتے ہیں۔ اس کے بعد دونوں شہزادے خود آئے اور دستور مجلس کے مطابق خود مؤطا بڑھ کر امام صاحب کو سنائی۔ ہارون رشید امین اور مامون کو لے کر ان کی مجلس درس میں حاضر ہوا اور سماعت کی۔ امام صاحب نے علم کے وقار کو ہمیشہ بلند رکھا، امراء و خلفاء کے دربار میں جا کر درس نہ دیتے اور جب وہ لوگ ان کی مجلس میں آتے تو ان کے ساتھ اسی طرح بیش آتے جس طرح دوسرے طالبان علم کے ساتھ۔

بہت معتبر تسلیم نہیں کیا ہے۔ یہ رسالہ بھی چھپ گیا ہے۔

۴۔ کتاب الماثور عن مالک فی احکام القرآن: اس میں امام احکام کی تفسیریں روایت کی گئی ہیں۔ ان کو علوم قرآنی کے مشہور عالم ابو محمد علی اندلسی (م ۷۴۷ھ) نے مرتب کیا ہے۔

۵۔ کتاب المناسک: ایک بڑی تصنیف تھی جس میں حج کے احکام و مسائل کا بیان تھا۔

۶۔ کتاب المجالس عن مالک: امام صاحب کے شاگرد ابن مجلسوں میں بیان کیے گئے حدیث و آثار و اخلاق سے متعلق فوائد کو اس کتاب میں ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔

چند رسالوں اور ایک تفسیر قرآن کی نسبت بھی ان کی طرف کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ تفریق مسائل میں ان کے فتاویٰ وغیرہ بھی اہمیت رکھتے ہیں۔

امام مالک کی تصانیف میں سب سے اہم ان کی موطا ہے جو اہل مدینہ کے فتاویٰ اور روایات کا بہترین انتخاب ہے: مدینہ علوم اسلامیہ و حدیث نبوی کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ امام مالک یہیں پیدا ہوئے بڑھے اور یہیں کے علوم سے پوری طرح فیضیاب ہوئے۔ موطا میں انھوں نے اہل مدینہ ہی کی روایت کو بیان کیا ہے اور چونکہ انھوں نے روایات کی محنت کا پورا التزام رکھا ہے اس لیے یہ مجموعہ بغیر کسی رد و قدح کے صحیح تسلیم

کیا جاتا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:

"پھر امام مالک نے موطا تصنیف کی اور حدیث اہل حجاز میں سے تو ہی روایت کو تلاش کر کے اس کے ساتھ صحابہ کے اقوال اور تابعین و علماء مابعد کے فتاویٰ کو بھی درج کیا۔"

امام مالک نے رواۃ کے بارے میں غیر معمولی تحقیق سے کام لیا اور جو شخص روایت حدیث میں ان کے معیار پر پورا نہ اُترتا تھا اس کی روایت کو نہ لیتے تھے۔ وہ صحیح روایات کے علاوہ کوئی دوسری چیز روایت نہ کرتے تھے اور نہ ہی کسی غیر ثقہ آدمی سے حدیث نقل کراتے تھے۔ حافظ ذہبی نے لکھا ہے:

"بلاشبہ موطا کی دلوں میں جو وقعت اور قلوب میں جو

اہمیت ہے اس کا کوئی چیز مقابلہ نہیں کر سکتی۔"

امام صاحب نے جب موطا کی تالیف شروع کی اور دوسرے علماء کو اس کا علم ہوا تو وہ بھی اپنی اپنی احادیث کے مجموعے مرتب کرنے لگے۔ لوگوں نے اس کا ذکر امام صاحب سے کیا تو آپ نے فرمایا کہ "صرف حسن نیت کو بقا ہے" امام صاحب کی یہ پیشین گوئی درست ثابت ہوئی اور اس دور میں موطا امام مالک کے ظہور پر در اس کے مقابلے میں جتنی بھی موطا میں لکھی گئیں ان میں سے کسی کا بھی مرتبہ ان کی کتاب کو نہ پہنچ سکا۔ امام صاحب نے اسے مکمل

کا لفظ اپنی حقیقت کا آپ مفسر ہے کہ یہ ان مسائل پر مشتمل ہے جن پر صحابہ کا عمل رہا ہے اور جہود و سلف جن پر چلے ہیں۔

امام مالک نے ایک لاکھ حدیثیں روایت کی ہیں انہی میں سے دس ہزار احادیث کو شروع میں مؤطا میں داخل کر لیا تھا پھر ان کی تہذیب و تنقیح کرتے رہے آخر ان میں سے ۱۷۲۰ روایات باقی رہ گئیں۔ چونکہ درس کے وقت امام صاحب کے بہت سے شاگرد احادیث و مسائل کو لکھ لیا کرتے تھے اس لیے مؤطا کے متعدد نسخے تیار ہو گئے۔ ان نسخوں میں حدیثوں کی تعداد میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ مؤطا میں مختلف طریقوں سے مروی ہے ان میں سے کچھ کے نزدیک سولہ اور کچھ کے نزدیک گیارہ معتبر ہیں۔ لیکن عام طور سے چار نسخوں کی صحت پر تمام علماء متفق ہیں جن میں پہلا نسخہ یحییٰ بن یحییٰ اللیثی کا دوسرا ابن یحیر کا تیسرا ابو مصعب کا اور چوتھا ابن وہب کا ہے لیکن ان چاروں میں یحییٰ اللیثی کی روایت والا نسخہ متداول اور شہور ہے۔ عام طور سے یہ نسخہ لوگ پڑھتے ہیں۔

مؤطا سے قبل اور اس کے زمانے میں بھی بہت سی کتب احادیث مرتب کی گئیں لیکن کسی کو بھی شرف قبولیت اور صحت کا درجہ حاصل نہ ہو سکا، ان میں سے تقریباً سب ہی ضائع ہو گئیں۔ مؤطا امام مالک کی چند امتیازی خصوصیات یہ بیان کی جاتی ہیں :

۱۔ کے شیوخ حدیث کے سامنے پیش کیا اور سب نے ان کے اس کام کو سراہا، ایک شاعر نے مؤطا کی بہت تعریف کی ہے جس کا مفہوم ہے :

"مؤطا امام مالک کو مضبوطی سے پکڑ لو، اگر یہ کھو گئی تو پھر حق کی کوئی ہمسگہ نہ ہوگی اور مؤطا کے لیے ان دوسرے علوم کو چھوڑ دو جن کے تم تلاش ہو، اس لیے کہ مؤطا آفتاب ہے اور دوسری کتا ہیں ستارہ"۔

مؤطا کے معنی ہیں زندہ ہوا، علماء نے اس کے مجازی معنی یہ بیان کیے ہیں کہ جس پر عام ائمہ اور علماء اور اکابر چلے ہوں اور جس کو ان سب کی راہوں نے زندہ اور پامال کیا ہو یعنی سب نے اس کے متعلق گفتگو کی ہو اور اس سے اتفاق کیا ہو، چونکہ امام صاحب نے اسے بہت شیوخ کے سامنے پیش کیا تھا اور انہوں نے اس کو پسند کیا تھا اور اس سے اتفاق کیا تھا اس لیے اس کا نام مؤطا پڑا۔

۲۔ مؤطا اس راستے کو کہتے ہیں جس پر لوگ بکثرت گزرے ہوں، سنت کے معنی بھی راستے کے ہیں۔ یہ وہ راستہ ہے جس پر آنحضرتؐ گزرے۔ غرض مؤطا وہ پامال راستہ ہے جس پر آنحضرتؐ کے بعد تمام صحابہ گزرے۔ غرض مؤطا

اسلم کی صفت میں ہے۔ امام صاحب کی زندگی ہی میں موطا کے نسخے بہت سے اسلامی ملکوں میں پھیل گئے تھے اور اسے آخذ منہج کے طور پر سمجھا جانے لگا تھا۔ سبھی کتاب کے قبول عام کا ایک ثبوت یہ بھی ہوتا ہے کہ اس کی شرحیں بھی جائیں تعلقات مرتب ہوں اور حواشی تیار کیے جائیں۔ علمائے حدیث کی ایک بڑی تعداد نے موطا کی طرف توجہ کی اور اس کی احادیث کی تخریج کی، مشکل اور نامانوس الفاظ کی تشریح کی، اس کی مشکلات کو حل کیا، اس کے مسائل کی توضیح کی، فقہی مباحث اور رجال پر بحثیں کیں، ان میں سے چند کے نام حسب ذیل ہیں:

- ۱۔ ابن حبیب مائگی (۲۳۹ھ)
- ۲۔ ابو عمر یوسف بن عبدالبر اندلسی (۴۶۳ھ) نے انقیض الحدیث الموطا اور التہدید لمافی الموطا من المعانی والاسانید کے نام سے دو کتابیں لکھیں۔
- ۳۔ امام سیوطی (۵۱۱ھ) نے بھی کشف الموطا فی شرح الموطا کے نام سے ایک کتاب لکھی پھر تنویر المالحاک کے نام سے اس کی تکمیل کی۔
- ۴۔ محمد بن عبد الباقی زرقانی مائگی (۱۱۴۴ھ) نے تین جلدوں میں موطا کی مفصل تشریح شرح زرقانی کے نام سے کی۔
- ہندستان کے بعض علماء اور بزرگوں کو موطا سے بڑا شغف رہا ہے، خاص طور سے شاہ ولی اللہ (۱۱۴۶ھ) اور ان کے خاندان کے لوگ صحت احادیث کی وجہ سے اس کے بڑے قائل تھے۔ شاہ صاحب نے اس کی دو شرحیں المنصفی فارسی میں اور المسوی عربی میں لکھیں۔ مولانا محمد زکریا کاندھلوی نے بھی اجزاء المسالک کے نام

۱۔ موطا سے پہلے جو کتب حدیث تیار ہوئیں ان کی بنیاد زیادہ تر صحابہ و تابعین کے آثار و فتاویٰ تھے، امام صاحب احادیث صحیحہ کو پہلی بنیاد اور آثار صحابہ و فتادی کو دوسری بنیاد قرار دیا۔

۲۔ عام طور سے اس زمانے کی کتابوں میں صحت کا زیادہ خیال نہیں رکھا گیا تھا، لیکن امام صاحب نے اسی حدیث یا فتوے کو قبول کیا جس کی صحت پوری طرح ثابت تھی۔

۳۔ موطا کی تالیف مدینہ میں ہوئی اور اس میں عام طور سے حجاز ہی کے محدثین و شیوخ کی روایتیں درج ہیں، اور علماء اس پر عام طور سے متفق ہیں کہ اہل حجاز کی حدیثیں اپنی صحت و سند کے لحاظ سے دوسری تمام جگہ کی حدیثوں پر فائق ہیں۔

۴۔ موطا کی تصنیف کے وقت بہت سے اہم تصانیف تابعین موجود تھیں۔

۵۔ امام مالک کے نزدیک راوی کے لیے ضروری ہے کہ وہ جس روایت کو بیان کرے اس کا حافظ بھی ہو۔

۶۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین کے درمیان جتنے کم واسطے ہوں گے حدیث اتنی ہی معتبر و مستکم ہوگی۔ موطا کی حدیثیں عام طور سے تین یا چار واسطوں سے بیان کی گئی ہیں۔

علمائے حدیث نے حدیث کی کتابوں کو چار طبقوں میں تقسیم کیا ہے، موطا طبقہ اول میں شمار ہوتی ہے، یعنی اس کا درجہ بخاری و

سے اس کی مفصل شرح لکھی۔

کچھ لوگوں نے نوحا کی فیض بھی کی ہے جن میں امام خطابی (۲۸۸ھ) سیوطی (۹۱۱ھ) ابن حزم (۴۵۶ھ) وغیرہ مشہور ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے لوگوں نے اس کے مختلف پہلوؤں پر الگ الگ کتابیں لکھیں جن کی مجموعی تعداد ستر کے لگ بھگ ہے۔

## امام شافعیؒ

ولادت ۱۵۰ھ - وفات ۲۰۴ھ

ان کا نام محمد بن ادریس اور کنیت ابو عبد اللہ ہے۔ شافعی ان کے جد املا شافع کی طرف نسبت ہے۔ ان کا سلسلہ نسب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتا ہے، ان کی پیدائش غزہ میں ۱۵۰ھ میں ہوئی۔ ان کا زمانہ علوم و فنون کے عروج کا زمانہ تھا، حدیث اور اس سے متعلقہ علوم کا ہر بہت چرچا تھا، فقہ نے باقاعدہ فن کی شکل اختیار کر لی تھی، امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد ان کی دکھائی ہوئی روشنی میں برابر آگے بڑھ رہے تھے، امام مالک کا حلقہ درس بھی پوری آب و تاب کے ساتھ جاری تھا۔ امام شافعی نے اپنے دور کے بہت سے علماء سے کسب فیض لیا۔ اور پھر خود کتاب و سنت کی روشنی میں اپنے اجتہادی نقطہ نظر

محمد بن علی، اسماعیل بن جعفر، محمد بن خالد اور عبدالعزیز ماجنون وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔

امام شافعی فکر معاش کے سلسلے میں پریشان رہتے تھے، کچھ لوگوں کی سفارش پر انھیں خیران کا عامل بنا دیا گیا، مین کا والی بہت ظالم تھا، امام شافعی اس کو ظلم و ستم سے روکتے تھے اس لیے وہ ان سے ناراض ہو گیا اور ان کی شکایت خلیفہ ہارون رشید کو لکھ بھیجی کہ امام شافعی علوی سادات کے ساتھ ہیں اور اس سے حکومت کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ ہارون رشید بہت ناراض ہوا اور انھیں دارالخلافت بھیجے جانے کا حکم دیا جس وقت امام شافعی دوبارہ میں پیش ہوئے، قاضی امام محمد وہاں موجود تھے، ان کی سفارش پر امام شافعی کی رہائی ہوئی، واقعہ ۱۸۴ھ کا ہے۔

رہائی کے بعد امام شافعی امام محمد کے حلقہ درس میں شامل ہو گئے، یہیں سے ان کی زندگی کا نیا دور شروع ہوا، فقہی علوم کی طرف ان کی توجہ بڑھی۔ امام محمد سے بہت زیادہ متاثر ہوئے اور ان سے جو فیض ان کو پہنچا اسے اپنی زندگی کا سرمایہ قرار دیتے تھے، اور کہا کرتے تھے کہ جو شخص فقہ میں نام کمانا چاہتا ہو وہ امام ابوحنیفہ کے اصحاب سے استفادہ کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے استخراج و استنباط مسائل کی راہیں ان لوگوں کے لیے کھول دی ہیں، تم کھا کر کہا کرتے تھے کہ اگر میں نے امام محمد کی کتبی نہ پڑھی

کو لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ استخراج مسائل کے اصول و ضوابط متفرک کیے اور فقہ میں بہت نام پیدا کیا۔

امام شافعی کو ان کی والدہ بچپن ہی میں مکر لے گئیں اور وہیں ان کی پرورش ہوئی، ان کی ابتدائی زندگی تنگ دستی اور پریشانی میں گزری۔ شروع میں تاریخ، ادب و شعر وغیرہ کی مروجہ تعلیم حاصل کی۔ پھر حدیث فقہ کی طرف متوجہ ہوئے اور تھوڑے ہی عرصے میں قرآن مجید اور مؤطا امام مالک حفظ کر لی۔ ابتدا میں اشعار عرب میں خاصی دل چسپی لیتے تھے، پھر ان کو فقہ کا ذوق پیدا ہوا تو مسلم بن خالد زہبی جو اس وقت مکر کے مفتی تھے، کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان سے استفادہ کے بعد مدینہ جا کر امام مالک کے حلقہ درس میں شامل ہوئے۔ جب انھوں نے امام مالک کے سامنے مؤطا کی قرارت زبانی کی تو امام مالک بہت خوش اور متاثر ہوئے اور فرمایا تمھارے قلب میں ایک نور ہے، معاصی سے اسے ضائع نہ کرنا، تم تقویٰ کو اپنا شعار بنانا۔ ایک زمانہ آئے گا کہ خدا تمھیں عظمت دے گا۔

تھوڑے دن امام مالک سے استفادہ کرنے کے بعد مکر معظمہ واپس آ گئے اور وہاں کے شیوخ سے کسب فیض کرتے رہے۔ امام مالک کے علاوہ ان کے اساتذہ میں لوگوں نے سفیان بن عیینہ، امام محمد مسلم بن خالد، ابراہیم بن سعد، سعید بن سالم، عبد الوہاب ثقفی،

بھڑے کوئی شخص کسی چیز کے متعلق سوال کرے اور میں نہ دوں تو مجھے بڑی شرم محسوس ہوتی ہے۔ ایک روز مسجد سے گھر واپس آ رہے تھے، راستے میں ایک غلام نے اپنے آقا کا سلام کہا کہ ایک تھیلی پیش کی، ذرا سی دیر بعد ایک اور شخص آیا اور کہا کہ میرے یہاں بچہ پیدا ہوا ہے اور میرے پاس کچھ نہیں ہے، آپ نے وہی تھیلی اسے دے دی۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ کرم و سخاوت انسان کی دنیا اور آخرت دونوں جگہ پردہ پوشی کرتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ عبادت و ریاضت اور زہد و تقویٰ کے اعلیٰ مقام پر تھے، تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ رات کے تین بجے کوٹے تھے، پہلے حصے میں علمی کام یعنی مجھے پڑھنے کا کام کرتے، دوسرے حصے میں عبادت الہی میں مصروف رہتے اور آخری حصے میں آرام فرماتے۔ خشیت الہی کا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ کسی کو یہ آیت تلاوت کرتے سنا، ھذا یوم لا ینطقون انہی وہ دن ہوگا جب نہ کوئی بول سکے گا اور نہ کوئی غدر پیش کر سکے گا، تو خوفِ خدا سے کانپ اٹھے اور بے ہوش ہو کر گر پڑے، جب ہوش آیا تو توبہ و استغفار میں لگ گئے اور روزِ روبرو اللہ سے اپنی مغفرت کی دعائیں مانگیں۔ ان کے شاگردوں اور ہمہرد نے ان کے مناقب لکھے ہیں اور ان کی جلالتِ شان، سحرِ علمی اور استنباطِ مسائل کی تعریف کی ہے۔ امام صاحب کے کچھ اقوال لوگوں نے لکھے ہیں جن سے ان کی عظمت کا پتا چلتا ہے۔ کہا کرتے تھے علم کی طلب کرنا نفلِ نماز سے بہتر ہے۔ جو شخص اپنی انانیت

ہوتی تو میں قناعت کے اس درجے پر نہ ہوتا۔ حدیث دفعہ دونوں میں امام صاحب کے شاگردوں کی تعداد بہت ہے، ان میں سے کچھ تو ایسے ہوئے ہیں جو آگے چل کر جڑی خشیت کے مالک ہوئے۔ ان میں سے چند کے نام یہ ہیں: بیلان بن داؤد، ابو بکر عبد اللہ بن زبیر حمیدی، احمد بن حنبل، ربیع بن سلیمان، ابو الولید موسیٰ بن جارد، اسحاق بن راہویہ وغیرہ۔ امام شافعی بڑے خوش خلق اور فیاض تھے، دوسرے کے لیے اپنی ضرورت کو بھول جاتے تھے، طبیعت میں خودداری اور غیرت تھی، امراء اور اعیانِ حکومت سے کسی چیز کے طالب نہ ہوتے تھے، البتہ محبت و عقیدت سے دیے گئے ہدایا قبول کر لیتے تھے۔ لیکن فیاضی مزاج کی بنا پر ان کا ہاتھ اکثر خالی ہی رہتا تھا۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ خلیفہ ہارون رشید جب کبھی ان کو دربار میں بلاتا تو اشرفیوں کی تھیلیاں پیش کرتا، امام صاحب واپسی پر انھیں تقسیم کرتے ہوئے اس طرح گھر پہنچتے کہ ان کے پاس کچھ بھی باقی نہ رہتا، لوگوں نے علیحدہ الوداع کے حوالے سے لکھا ہے کہ جب آپ مکہ منظرہ تشریف لائے تو آپ کے پاس دس ہزار درہم تھے۔ جب لوگوں کو ان کی آمد کی اطلاع ہوئی تو ملنے کے لیے بے شمار لوگ آئے، جن میں بہت سے ضرورت مند بھی ہوتے تھے، انھوں نے وہ تمام درہم ان لوگوں میں تقسیم کر دیے۔ کہا کرتے تھے کہ اگر



شاگردوں نے جمع کیا۔ اس کے علاوہ ان کی روایات کا ایک مجموعہ  
مسند شافعی کے نام سے مشہور ہے، جس کے متعلق شاہ عبدالعزیز  
لکھتے ہیں:

”یہ اُن احادیث مرفوعہ کا مجموعہ ہے جن کو خود  
امام شافعی اپنے شاگردوں کے سامنے سند کے  
ساتھ بیان فرمایا کرتے تھے۔ ان حدیثوں میں سے  
جو حدیثیں ابوالعباس محمد بن یعقوب الاصم نے رستم بن  
سلیمان مرادی سے سن کر کتاب الام اور مبسوط کے ضمن  
میں جمع کر دی تھیں، ان کو ایک جگہ جمع کر کے مسند امام  
شافعی نام رکھ دیا۔ رستم بن سلیمان نے جو امام شافعی  
کے بلا واسطہ شاگرد ہیں تمام حدیثوں کو امام شافعی سے  
سنا ہے۔ بہر حال وہ مسند نہ مساند ہی کی ترتیب  
پر ہے اور نہ ابواب کی بلکہ اس میں جو حدیث جہاں  
اور جیسے چاہا لکھ دیا۔ اسی وجہ سے اس مجموعے میں بہت  
تکرار ہے۔“

امام شافعی نے باقاعدہ درس حدیث کی کوئی مجلس قائم نہیں  
کی، وہ امام اور مجتہد تھے، حدیث کے فن سے پوری طرح واقف  
تھے اور اصولی حیثیت سے اس پر گفتگو کرتے تھے، استخراج و  
استنباط مسائل کے لیے صحیح حدیث ہی کو دلیل سمجھتے تھے۔ اسی لیے

اور عز و جاہ کو باقی رکھتے ہوئے علم حاصل کرنا چاہے وہ اس میں کامیاب  
نہیں ہو سکتا، علم عز و انکساری سے حاصل ہوتا ہے۔ علماء کے ہائے  
میں فرماتے تھے:

”علماء کا فقر اختیار اور جہال کا فقر اضطراری ہوتا ہے  
علماء کے لیے سب سے بڑے عیب کی بات یہ ہے کہ وہ دنیا  
کی طرف راغب ہوں اور آخرت کو بھول جائیں۔  
تواضع بلند کرداری کی دلیل ہے اور بخت برفلکی کی۔“

یوں تو امام شافعی کی اہمیت ان کے فقہ کی وجہ سے ہے،  
لیکن فقہ کا دار و مدار حدیث پر ہی ہوتا ہے اور جتنے بھی فقہاء ہوئے  
ہیں انھوں نے فقہ کی بنیاد احادیث ہی پر رکھی ہے۔ دوسرے یہ  
کہ اس دور میں دین سے واقفیت کے لیے حدیث کا مکمل علم ضروری  
ہوتا تھا۔ اس لیے لوگ اس فن کو ضرور حاصل کرتے تھے۔ درج مذکور  
خواہ کسی بھی فن کی ہو دلائل و دہانہ احادیث ہی سے تلاش کیے  
جاتے تھے۔ اسی لیے امام شافعی نے بھی ایک طرف تو علم حدیث  
حاصل کیا اور پھر اپنے درس کے سلسلے میں اسے استعمال کیا۔ بعد  
میں ان کے شاگردوں نے ان کی بیان کردہ روایات کو جمع کر دیا۔  
امام صاحب کی تصانیف کی مجموعی تعداد سو سے اوپر بیان کی جاتی  
ہے جن میں الرسالہ، اختلاف الحدیث، کتاب السنن، بیان الفضل،  
احکام القرآن، جامع العلم، کتاب الام اور کتاب المبسوط وغیرہ  
شامل ہیں

کتاب الام اور کتاب المبسوط فن حدیث میں ہیں جن کو ان کے

خاری ہو گیا اور وجد کی حالت میں بار بار اس مفہوم کا شعر پڑھتے تھے :

"میرے گناہ بہت بڑے بڑے ہیں لیکن میں  
تیری رحمت کی طرف نظر کرتا ہوں تو وہ میرے  
گناہوں کی نسبت کہیں زیادہ معلوم ہوتی ہے۔" لہ  
۵۴ سال کی عمر میں ۲۰۴ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ مصر میں  
آپ کا مزار ہے جو مزین خلافت ہے۔

حدیث کی تاریخ میں ان کا نام بھی آتا ہے۔ امام شافعی ساری  
عمر مذہب اور علم کی خدمت میں لگے رہے، ان کے زمانے میں  
بہت سی ایسی احادیث مل گئی تھیں جن سے پہلے کے ائمہ  
فائدہ نہ اٹھا سکے تھے اور حدیث کی عدم موجودگی میں اپنے اجتہاد  
و قیاس سے فتوے دیے گئے تھے اور وہ ان روایات کے  
خلاف تھے امام صاحب نے ان کو قبول نہ کیا۔ امام صاحب  
نے بہت سی روایات کو جمع کیا۔ حدیثوں کی تنقید کی اور اصول  
حدیث مرتب کیے۔ امام احمد بن حنبل کہتے ہیں کہ "میں حدیث  
کے بہت سے علوم سے ناواقف تھا مگر جب میں نے امام شافعی  
کی صحبت اختیار کی تو مجھے ان چیزوں کا پتا چلا۔ کوئی ایسا محدث  
نہیں ہے جس نے قلم دوات کو ہاتھ لگایا ہو مگر شافعی کا اس  
کی گردن پر احسان نہ ہو۔" لہ

ملا علی تارسی نے مرقاة المفاتیح میں لکھا ہے کہ ان کے شاگرد  
مزنی مرض الموت میں ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حال  
پوچھا تو فرمایا دنیا سے کوچ اور اجاب سے جدائی کا وقت ہے  
موت کا پیالہ پیش ہوا چاہتا ہے اور نیک اعمال کھنے والا ہے۔  
عنقریب اللہ کے دربار میں حاضری ہوگی۔ کون جانے میری روح  
جنت کی طرف روانہ ہوگی جس پر میں اس کو مبارکباد دوں یا  
نار کی طرف جس پر میں اس سے نفرت کروں۔ پھر آپ پر گریہ

چلے گئے تو امام احمد اپنی تنگ دستی کی وجہ سے ان کے پاس جاسکے۔  
 ان کو امام شافعی سے بڑی محبت تھی اور ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔  
 اکثر ان کے ساتھ سفر کرتے اور ان سے حدیث و فقہ کے متعلق سوالات  
 پوچھتے رہتے۔ امام شافعی کو بھی ان سے بہت انس تھا، ان کے زہد  
 تقویٰ اور علم و فضل کے ساتھ ساتھ ان کی دیانت و ثقاہت کے بھی  
 قائل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان سے روایت بھی کرتے تھے۔ اکثر جب  
 فتویٰ دیتے تو امام احمد سے بھی اس مسئلے پر ان کی رائے معلوم  
 کرتے، فرماتے تھے جب میں نے بغداد کو چھوڑا اس وقت وہاں علم و  
 فضل اور ورع و تقویٰ میں کوئی شخص امام احمد سے بڑھ کر نہ تھا۔  
 یہی بن معین کہتے ہیں کہ انھوں نے ان سے بہتر آدمی نہیں دیکھا۔  
 امام ابو ثور ان کو سفیان ثوری سے بڑا عالم اور فقیہ کہتے تھے۔  
 محمد علی بن مدینی ان کو حجت تسلیم کرتے تھے اور ان کے فتویٰ کو  
 قابل عمل مانتے تھے۔ ان کے تقویٰ اور دیانت کی تعریف کی گئی  
 ہے اور جو شخص ان پر شبہ کرے اسے قابل مذمت سمجھا گیا ہے۔  
 سفیان بن دیک کہتے تھے کہ امام احمد کی برائی کرنے والے کو  
 فاسق و فاجر سمجھنا چاہیے یہ

امام احمد علم حدیث کے ماہر تھے، محدث کے لیے جن خوبیوں  
 کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب ان میں موجود تھیں، قوت حافظہ  
 غضب کی تھی۔ ان کے پاس بہت سی کتابیں تھیں جو ان کی زبانی

لے تذکرۃ المدینین ج ۱ ص ۱۳۵ بحوالہ طبقات الشافعیہ و طبقات الفقہاء۔

## امام احمد بن حنبل

(ولادت ۱۶۴ھ - وفات ۲۴۱ھ)

ان کی ولادت ۱۶۴ھ میں ہوئی، ان کا خاندانی سلسلہ  
 بنو شیبان سے ملتا ہے جو قبیلہ عدنان کی ایک شاخ تھا، ان کا خاندان  
 دینی اور دنیاوی دونوں میدانوں میں مشہور تھا۔ یہ بچپن ہی سے  
 علم کے شوقین تھے، حافظہ بہت اچھا تھا، چھوٹی عمر میں ہی قرآن مجید  
 حفظ کر لیا تھا اس کے بعد حدیث پڑھنا شروع کیا اور جلد ہی اس فن کی  
 تکمیل کر لی۔ ان کی ابتدائی تعلیم بغداد میں ہوئی۔ اس کے بعد کوفہ، بصرہ،  
 مکہ، مدینہ، یمن اور شام وغیرہ گئے اور وہاں کے علماء سے کسب فیض کیا۔  
 ان کے اساتذہ میں حافظ ہشیم، سفیان بن عیینہ، سلیمان بن  
 داؤد طرابلسی، دیک بن جراح اور یحییٰ بن سعید وغیرہ تھے۔ ان کے علاوہ  
 امام شافعی سے بھی تلمذ کیا تھا، ان سے انھوں نے فقہ اور حدیث  
 کی تعلیم خاص طور سے حاصل کی تھی، جب امام شافعی بغداد سے مصر

تیار ہو جاتے اور باجماعت نماز ادا کرتے، فوافل و تہجد کے بھی پہن  
 ہی سے پابند تھے۔ تلاوت اور دعا و استغفار بھی معمول میں شامل  
 تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کی دعاؤں کو قبول بھی کرتا تھا، اسی وجہ سے  
 لوگ ان سے دعا کی درخواست کرتے تھے۔ ضرورت مندوں اور  
 غریبوں کی مدد کر کے خوشی محسوس کرتے تھے۔ امرا اور بادشاہوں  
 کی بھی چوٹی چیزوں کو قبول نہ کرتے اور اگر کبھی لے لیتے تو غریبوں  
 کو تقسیم کر دیتے۔ دنیا اور دنیا کے لوازمات سے ان کو ذرا بھی دل چسپی  
 نہ تھی۔ اپنی مجلس میں اس قسم کے تذکرہ کو پسند نہ کرتے تھے غلطی  
 وقت نے دولت و ثروت سے ان کی جھولی بھرنی چاہی مگر انھوں  
 نے اسے قبول نہ کیا۔ کہتے تھے دنیا چند روزہ ہے، یہاں کے عیش و  
 عشرت سے آخرت کی زندگیوں خراب کردیں، بس دن ان کے پاس  
 کچھ نہ ہوتا اس دن کو اپنے لیے مبارک اور آرام کا دن قرار دیتے  
 تھے۔ رسول اللہ صلیم کی زندگی کی سچی پروری آپ کا بنیادی اصول تھا۔  
 سنت رسول کی حیات اور اسے عام لوگوں تک پہنچانا آپ کا مقصد  
 تھا۔ خود نہ کسی سنت کو چھوڑتے اور نہ ایسے لوگوں کو پسند کرتے جو  
 سنت سے بے رغبتی کریں۔

خلفاء و سلاطین سے دور دور رہتے تھے، ان کے پیش کیے  
 ہوئے عہدوں کو قبول نہ کرتے تھے۔ امام شافعی نے ان کو یمن کا  
 قاضی بننے کی ترغیب دی تو انھوں نے جواب دیا کہ میں آپ کے  
 پاس علم کی تلاش میں آیا ہوں، اگر آپ کے پاس علم کی دولت  
 نہ ہوتی تو میں آپ سے تعلقات منقطع کر لیتا۔ کچھ لوگوں نے ان کو

یاد تھیں، حدیث کے ماہرین نے ان کو ثقت لوگوں میں شمار کیا ہے۔  
 امام شافعی کہتے تھے کہ ہندو کی عجیب چیزوں میں ایک یہ نوجوان بھی  
 تھا، کم سنی کی وجہ سے جس کے بال بھی سیاہ نہیں ہوئے تھے مگر  
 جب وہ حنا کہتا تھا تو ہر طرف سے صدق کی آوازیں سنائی دیتی  
 تھیں۔ حدیث کے بہت بڑے حافظ تھے، کھڑی کھڑی روایتوں کو  
 آسانی سے الگ الگ کر سکتے تھے، ان کے بزرگوں اور ہم عصر  
 کو ان پر پوری طرح اعتبار تھا اور ان کی بیان کی ہوئی روایات  
 کو آسانی اور بغیر تکلف کے قبول کر لیتے تھے۔ امام احمد اپنے کو دنیا  
 اور دنیا کی الجھنوں سے الگ رکھتے تھے، نام و نمود کی بھی ان کو  
 خواہش نہ تھی، ان کی علمی شہرت بہت تھوڑے عرصے میں اطراف  
 عالم میں پھیل گئی، ہر وقت علم کے پیاسوں کی بھرآپ کے یہاں جمع  
 رہتی۔ آپ نے چالیس سال کی عمر میں درس و تدریس کا کام شروع  
 کیا، درس کی مجلس میں لوگ بہت سکون و یکسوئی کے ساتھ شریک  
 ہوتے۔ وقار و سنجیدگی اور ایک خاص قسم کا رعب اس مجلس کی  
 نمایاں خصوصیت تھی۔ اس میں شریک ہونے والے لوگ بڑے  
 غور و انہماک سے درس سنتے۔ اکثر اس مجلس کے شرکار کی تعداد  
 ہزاروں تک پہنچ جاتی تھی۔

نماز، روزے اور دوسرے مذہبی فرائض کے مشرور  
 ہی سے پابند تھے، عام طور سے اذان سے پہلے ہی نماز کے لیے

مشورہ دیا کہ اُمراء و سلاطین سے قریب ہو کر ان کی اصلاح اور ام  
 بالمعروف و نہی عن المنکر میں آسانی ہوگی، انھوں نے جواب دیا کہ  
 ان کی صحبت بہت خطرناک اور بڑا فتنہ ہے، جب ان سے دور رہ کر  
 پچنا مشکل ہوتا ہے تو قریب رہ کر زیادہ خرابی کا ہی امکان ہے۔  
 خلیفہ متوکل آپ کا بہت قدردان تھا، اکثر خیریت معلوم کرنے  
 کے لیے آدمی بھیجتا، اُمور سلطنت اور اہم مسائل میں ان کی رائے لیتا،  
 عزت و محرم کے ساتھ مال و دولت بھی پیش کرتا۔ لیکن یہ سب  
 چیزیں ان کے لیے بڑھتی ہوئی تھیں اور کبھی کبھی اس پر رویہ کرتے  
 تھے۔ ایک مرتبہ خلیفہ متوکل کے اصرار سے مجبور ہو کر اس سے ملنے  
 گئے، چند روز قیام رہا مگر شاہی کھانوں سے پرہیز کیا، صرف ستو  
 کھاتے اور روزہ رکھتے خلیفہ نے خلعت دی جب واپس ہونے لگے  
 تو اسے وہیں چھوڑ دیا اور فرمایا کہ اسے فروخت کر کے رقم کو ضرورت  
 مندوں پر تقسیم کر دیا جائے۔ اپنے عزیزوں اور ارادت مندوں کو  
 بھی اُمراء اور رؤساء سے ملنے سے بچنے کی رائے دیتے تھے۔ ایک  
 بار کئی روز کے فائے کے بعد کسی شاگرد سے آگاہا دھارایا، جب روٹی  
 یک کر آئی تو پوچھا اتنی جلدی کیسے تیار ہوئی، جواب ملا کہ پڑوس میں  
 چوٹھاجل رہا پچھا جلدی کے خیال سے وہیں پکایا، آپ نے اس حال  
 میں بھی اس روٹی کو کھانے سے انکار کر دیا کہ وہ پڑوسی اُمراء کے تحفے  
 قبول کرتے تھے۔ ایک مرتبہ متوکل نے کچھ درہم بھیجے، اُن کو اس کی  
 وجہ سے عیند نہ آئی، آخر گھر والوں کو بلا کر کہا کہ مجھے ان درہموں کی  
 وجہ سے عیند نہیں آرہی ہے اس لیے انھیں غریبوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

گھر والوں نے اُسی وقت تمام رقم تقسیم کر دی تو آپ سو گئے۔  
 انکار اور تواضع ان کے مزاج کا خاصہ تھا، غیر معمولی شہرت  
 و مقبولیت کے باوجود ہر ایک سے بڑی خوش اخلاقی اور خندہ  
 پیشانی سے ملنے، نخر و برتری کا اظہار کسی وقت نہ ہونے دیتے۔  
 اپنا کام خود اپنے ہاتھ سے کرتے، یہاں تک کہ وضو کے لیے بھی  
 خود ہی کنوئیں سے پانی نکالتے، پیاری کی حالت میں نوکر ہنکھا  
 جھلتا تو اسے روک دیتے۔ ہر شخص کے ساتھ حسن سلوک کرتے،  
 اپنے ساتھ دوسروں کے سلوک کا بدلہ بھی چکانے کی کوشش کرتے،  
 اگر کسی کی بات ناگوار ہوتی تو اسے برداشت کرتے، طبیعت میں  
 وقار و وقامت تھی، اسی لیے بلا وجہ گھومنا پھرنا، بازاروں میں جانا اور  
 فی ضرورتی باتیں کرنا پسند نہ کرتے تھے، تفریحات سے بھی پرہیز  
 کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اس سے علم کی عظمت و شان میں کمی  
 آتی ہے، علی بلیوں کے بعد تنہائی کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ ان  
 کی آمدنی کا ذریعہ ایک خاندانی جائیداد تھی جس سے چند درہم ماہوار  
 کی آمدنی ہوتی تھی، اسی میں گزربسر کرتے اور اللہ کا شکر ادا  
 کرتے، چونکہ یہ آمدنی کسی طرح بھی ضروری اخراجات کی تکمیل  
 نہ ہو سکتی تھی اس لیے گھر میں کسی کئی دن چولہا نہ جلتا اور فائدہ  
 ہوتا مگر آپ مطمئن رہتے اور اپنی حالت کسی پر فخر نہ کرتے۔ لوگ  
 تحفوں یا رقبوں کی پیشکش کرتے تو شکرے کے ساتھ واپس کر دیتے۔  
 غذا بہت معمولی اور سادہ کھاتے، اکثر خشک روٹی کے ٹکڑے جھلو کر  
 سر کر کے کھا لیتے۔

لوگ ان کو سزاؤں کی ہولناکی سے ڈراتے تو حدیث سُناتے کہ تم سے پہلے کے لوگوں کو آردوں سے چیر دیا جاتا تھا مگر وہ اپنے دین سے منہ نہیں پھرتے تھے۔

خود مختصم نے بھی اس بات کی کوشش کی کہ امام صاحب اپنے خیالات میں نرمی پیدا کر لیں مگر وہ کسی طرح سے راضی نہ ہوئے اور اپنے موقف پر قائم رہے، آخر مختصم کے حکم سے ان کے کوٹے لگائے گئے، بحلیف سے عیش کی کیفیت طاری ہو جاتی، جب ذرا ہوش آتا تو لوگ پھر ان کو خلیفہ کی بات ماننے پر آمادہ کرتے، مگر یہ اس حال میں بھی کسی بات کو ماننے کے لیے تیار نہ ہوتے، اسی کوڑے لگنے کے بعد ان کی حالت بگڑ گئی تو خلیفہ نے گھر کر ان کو رہا کر دیا۔ مختصم پر ان کے پختہ عقیدے کا اثر ہوا اور اتنی سختی برتنے پر پشیمانی رہی۔ رہائی کے بعد اس نے ان کی دیکھ بھال اور علاج کے لیے معمول انتظام کیا اور صحت یاب ہونے پر خوشی کا اظہار کیا۔ امام صاحب اتنی تکلیفیں اٹھانے کے بعد خاصے کمزور ہو گئے تھے، بعض زخم ایسے تھے جن کی تکلیف ساری عمر آپ محسوس کرتے رہے،

امام صاحب کہتے تھے جس وقت اللہ کو کوڑے لگانے کے لیے لے جایا گیا ایک شخص نے پشت سے میرا دامن پکڑ کر کہا میں بدعاش ترین انسان ابوالہشیم ڈاکو ہوں، پوری اور ڈاکوؤں کے جُسر میں تجھے ہزار بار کوڑے لگائے جائیں، میں مگر اپنی حرکتوں سے باز نہیں آیا۔ تم کو خدا کی راہ میں سزا ملے گی اس لیے تم کو حق سے انحراف

مامون کے دور میں معتزلہ کے مذہب کو کافی عروج حاصل ہوا اس کی وجہ خلیفہ کی سرپرستی تھی۔ خاص طور سے خلقِ قرآن کے مسئلے نے بہت شدت اختیار کی، لوگوں سے زبردستی قرآن کے مخلوق ہونے کا اقرار کرایا جاتا، جو لوگ ایسا نہ کرتے ان کو سخت سے سخت سزائیں دی جاتیں۔ یہاں تک کہ ان کے قتل سے بھی دریغ نہ کیا جاتا۔ بہت سے علماء نے خوفِ زدہ ہو کر اس کا اقرار کر لیا، جو نہ مانے اُن کو سزائیں بھگتنی پڑیں۔ امام صاحب سے جب اس مسئلے میں سوال کیا گیا تو فرمایا قرآن خدا کا کلام ہے اور میں اسے مخلوق نہیں کہہ سکتا۔ ان کو قید کر کے مامون کے دربار کے لیے روانہ کیا گیا۔ ابھی یہ راستے ہی میں تھے کہ مامون کا انتقال ہو گیا۔ امام صاحب کو اسی طرح یزیدوں اور زنجیروں میں جکڑ کر بغداد واپس لایا گیا اور قید رکھا گیا، مامون نے مرتے وقت اپنے جانشین مختصم کو وصیت کی تھی کہ خلقِ قرآن کے عقیدے کا لوگوں سے اقرار ضرور کرایا جائے، مختصم نے اس وصیت کو مامون سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ پورا کیا۔ امام صاحب کو بھی مختصم کے سامنے پیش کیا گیا۔ لوگوں نے ان کو بہت ابھایا کہ جب دوسرے بہت سے علماء نے اسے تسلیم کر لیا ہے تو آخر آپ اکیلے ہی اس سے کیوں انکار کرتے ہیں اور سزاؤں کی تکالیف برداشت کرتے ہیں۔ بعض لوگوں نے نصحت وغیرہ کی احادیث پیش کر کے ان کو قائل کرنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے کسی بھی بات کو نہ مانا، کہتے رہے کہ کتاب اللہ اور سنت نبوی سے اس کے اقرار کا ثبوت پیش کر دو تو مان لوں گا ورنہ نہیں جب

کوئی معاصر صاحب علم ان کا شریک نہیں ہے۔  
علی بن مدینی کہتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے یوم رعدہ میں حضرت ابو بکر کے  
ذریعے سے اسلام کی مدد کی اور فتنہ خلقِ تیسرا ان میں  
امام احمد کے ذریعے اسلام کو بچایا۔" ۱۷

۱۷ ربيع الاول ۲۴۱ھ میں ۷۷ سال کی عمر میں ان کا انتقال  
ہوا۔ انتقال کی خبر سے ہر طرف غم کی لہر پھیل گئی۔ بنائے میں بے شمار  
لوگ شریک ہوئے، بعض مورخین نے لکھا ہے کہ اتنی بڑی تعداد  
کسی اور کے جنازے میں دیکھنے اور سننے میں نہیں آئی۔

امام احمد اپنے علم و فضل کے اعتبار سے بڑی اہمیت کے  
مالک ہیں یہ مسلمانوں کے چار بڑے فقہی مسکوں میں سے ایک کے  
بانی ہیں۔ یہ دوسرے علماء و محدثین کی طرح سے عقلی توجہات کے  
زیادہ قائل نہ تھے، ہر چیز کو قرآن و سنت کی روشنی میں دیکھتے تھے  
اور جس کی مثال کلام اللہ اور حدیث نبوی میں نہ ملتی اسے تسلیم نہ  
کرتے تھے بغیر ضروری سوالات سے احتراز کرنے کو کہتے تھے۔ قرآن  
اور صفاتِ الہی کے بارے میں ان کی رائے مستحکم تھی۔ وہ کہتے  
تھے کہ جس طرح سے اللہ قدیم ہے اسی طرح سے اس کی صفات بھی  
قدیم ہیں چونکہ کلام اللہ کی صفت ہے اس لیے وہ بھی قدیم ہے۔ وہ  
کسی بھی مسلمان کو کافر نہیں سمجھتے تھے خواہ وہ احکامِ خداوندی کو پورا

کا خیال بھی دل میں نہیں لانا چاہیے۔ امام صاحب کو ابوالثیم کی اس  
گفتگو نے بڑی ہمت دی اور وہ ہمیشہ اس کے لیے دعائے مغفرت  
کرتے رہے۔

مستقیم اور واقع کے بعد جب متوکل خلیفہ ہوا تو اس نے کتابِ سنت  
کے خلاف جو عقائد پھیل گئے تھے، ان کو ختم کیا اور امام صاحب کی  
عزت و تحکیم کی۔ اسی کے عہد میں معتزلہ کا زور کم ہوا اور ان کی  
قوت ٹوٹ گئی۔ امام صاحب چونکہ اپنے عقیدے پر پوری شجرت  
سے تھے رہے اور جو حق سمجھتے تھے وہ کہتے تھے، اس لیے ان کی  
عزت، شہرت اور مقبولیت بہت بڑھ گئی۔ بعض بزرگوں نے لکھا  
ہے کہ امام صاحب کی ثابت قدمی اور قربانی نے اسلام کو بچایا۔  
علامہ ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ:

"امام احمد کی ذات گرامی صبر و استقامت اور  
استقامت علی الحق کے لیے ضرب المثل ہے، تین  
چار ہزار بادشاہوں کے ظلم و استبداد اور غیر معمولی  
مشکلات و شدائد کے باوجود ان کی استقامت و  
عزیمت میں فرق نہ آیا اور نہ وہ کتمانِ حق اور حفاظت  
علم کے متحکم ہوئے اور نہ رخصتوں اور فتنے کا  
سہارا لیا بلکہ ہر حال میں انھوں نے اپنے کو سنت  
نبوی اور آثارِ صحابہ سے وابستہ رکھا اور ان کی  
اشاعت و بدعات کا استیصال کرتے رہے۔ یہ وہ  
فصوصِ فضل و کمال ہے جس میں امام صاحب کا

تو پھر عقل کے استعمال کی اجازت تھی۔ تصنیف کتب کو اچھا نہ سمجھتے تھے۔  
 امام احمد چونکہ سنت نبوی پر پوری طرح سے کاربند تھے  
 اس لیے شروع ہی سے احادیث جمع کرنے کا شوق تھا۔ آپ  
 بوری توجہ کے ساتھ حدیث کی تلاش و جستجو کرتے تھے۔ کہا جاتا  
 ہے کہ آپ نے جو حدیث کا مجموعہ 'المسند' کے نام سے یادگار پھوڑا  
 ہے اسے سولہ سال کی عمر ہی سے مرتب کرنا شروع کر دیا تھا۔ طلب  
 حدیث کے لیے آپ علماء و محدثین کی خدمت میں حاضر ہوتے ان  
 سے حدیثیں سنتے اور جمع کرتے۔ ان کے صاحبزادے عبداللہ نے  
 ایک بار ان سے پوچھا کہ آپ کتب ابوں کی ترتیب و تدوین سے  
 روکتے ہیں اور خود مسند مرتب کر رہے ہیں تو جواب دیا کہ اسے میں  
 نے عوام کی رہنمائی کے لیے مرتب کیا ہے۔ جب انہیں سنت نبوی  
 میں کوئی اختلاف ہوگا تو اسے دیکھ لیں گے۔ بہر حال اس پر علماء  
 کا اتفاق ہے کہ 'مسند' خود امام صاحب کی جمع کی ہوئی ہے۔ امام  
 صاحب کے درس میں حدیث سننے والے بھی جمع رہتے تھے اور  
 پوچھ پوچھ کر حدیثیں سنا کرتے تھے۔ امام صاحب اسی مسند  
 سے ان لوگوں کو سنااتے تھے۔ انتقال سے کچھ پہلے اپنی اولاد  
 اور اپنے مخصوص شاگردوں کو متبع کر کے مسند کی روایات سنائیں  
 بعد میں آپ کے صاحبزادے عبداللہ کی روایت کے مطابق موجودہ  
 مسند مرتب ہوئی۔ بعض لوگوں نے اس منشیہ کا انہماک بھی کیا ہے

کرے یا نہ کرے، البتہ اس کے گناہگار ہونے کے قائل تھے۔ چونکہ  
 امام احمد احادیث نبویہ پر زیادہ اعتقاد کرتے تھے اس لیے بعض پرانے  
 علماء نے ان کو نقیبہ سے زیادہ محدث کا درجہ دیا ہے۔ مثلاً ابن جریر  
 طبری، ابن عبد البر، ابن قتیبہ وغیرہ نے ان کو اس زمرے میں شامل  
 کیا ہے، مگر عام طور سے ان کا شمار نہ صرف فقہاء بلکہ فقہائے اربعہ  
 میں کیا جاتا ہے۔ جن مذاہب کی صحت مسلم اور مشہور ہے وہ چار  
 ہیں: ابو حنیفہ، شافعی، مالک اور حنبل کے مذاہب۔

امام صاحب فقہی مسائل میں کتاب و سنت کو پہلا درجہ دیتے  
 تھے۔ کتاب و سنت کے بعد صحابہ کے اقوال ان کے نزدیک قابل  
 اعتقاد تھے۔ اگر متعدد صحابہ سے کسی مسئلے میں مختلف اقوال ملتے تو جو  
 قول کتاب و سنت سے قریب تر ہوتا اس کو مانتے تھے۔ اس سلسلے  
 میں صحابہ کی فضیلت کا بھی خیال رکھتے تھے۔ مثلاً خلفائے اربعہ کو تمام  
 اصحاب رسول پر ترجیح دیتے تھے، ان میں بھی شیخین اور شیخین میں  
 بھی حضرت ابو بکر کا درجہ بلند سمجھتے تھے اور ان کے قول کو قابل  
 عمل جانتے تھے۔ کبھی کبھی جب ایک معیار کے صحابہ کے اقوال میں  
 اختلاف ہوتا تو اپنی رائے کے مقابلے میں ان سب کے اقوال  
 پر عمل کو بہتر جانتے تھے، یہاں تک کہ کم درجے کی حدیث پر عمل کو  
 بھی اپنی رائے پر ترجیح دیتے تھے۔ قیاس ان کے یہاں آخری  
 منزل میں تھا، جب مسئلے کا حل مندرجہ بالا صورتوں میں نہ مل سکے



مکررات کو حذف کر دیا ہے۔ امام صاحب نے اپنی مسند میں صرف ثقہ راویوں ہی کی روایات کو شامل کیا ہے کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ آپ کسی روایت کو ثقہ سمجھ کر لکھ لیتے اور بعد میں معلوم ہوتا کہ وہ دُست نہیں ہے تو اسے نکال دیتے۔ امام صاحب نے بعض ضعیف حدیثیں بھی شامل کی ہیں مگر اس کی وجہ خود انھوں نے بیان کی ہے:

”میں حدیث کی مخالفت نہیں کرتا خواہ وہ ضعیف ہی ہو، لیکن ایسا اُس وقت ہوتا ہے جب کہ اُس بارے میں کوئی حدیث صحیح نہ ملتی ہو۔“

امام صاحب نے اس مسند کو تقریباً ساڑھے سات لاکھ حدیثوں سے منتخب کیا، اختیار کا یہ عالم تھا کہ آخر عمر تک کاٹ چھانٹ کا سلسلہ جاری رہا۔ علامہ نے مسند احمد کو حدیث کے اہم مجموعوں میں شمار کیا ہے، بعض نے اسے سنن ابی داؤد و جامع ترمذی کے ہم پل قرار دیا ہے اور بعض نے قدرے کم۔ لیکن اس پر سب کا اتفاق ہے کہ یہ مسند قابل اعتماد احادیث کا مجموعہ ہے۔ بہت سے لوگوں نے اس کی شرحیں لکھیں اور اختصار بھی کیے۔ ان میں ابو الحسن بن عبدالمبارک سندى ۱۱۳۸ھ کی شرح مسند خاصى اہم ہے۔ والد المتفقہ مسند

مکہ عبد اللہ نے بہت سی ایسی روایات بھی اس میں شامل کر دی ہیں جو اصل مسند میں نہیں تھیں، یہ شعبہ غالباً صرف اس وجہ سے ہوا کہ امام صاحب سے جو لوگ کسی حدیث کے متعلق سوال کرتے تھے۔ آپ صرف وہی حدیث سناد دیتے، لیکن بعد میں جب آپ کی عمر زیادہ ہو گئی اور یہ خیال آنے لگا کہ کسی وقت بھی اجل کا فرشتہ آ سکتا ہے تو آپ نے تمام احادیث کو سناد دیا۔ بہر حال یہ مسند امام عبد اللہ نے مرتب کی ہے اور اس میں وہ تمام روایات شامل ہیں جو آپ نے اپنے والد سے سنی تھیں۔ اس سے پہلے بھی حدیث کی ایسی کتابیں تیار کی گئی تھیں لیکن اس مسند کو غیر معمولی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس مسند میں احادیث صحابہ کی ترتیب کے مطابق جمع کی گئی ہیں۔ ایک صحابی کی حدیثیں ایک جگہ جمع کر دی ہیں اس میں بھی یہ خیال ہے کہ صحابیوں کی ترتیب اسلام میں سبقت کے لحاظ سے ہو۔ صحابہ کے بعد تابعین کی ترتیب میں بھی خیال رکھا ہے۔ چونکہ حدیث کی کتابیں مرتب کرنے کا یہ انداز پرانا ہے اس لیے بعد کے محدثین کو اس کے مطالعے میں مشکل پیش آئی۔ بعض لوگوں نے اسے ابواب کے تحت بھی از سر نو مرتب کیا مگر عام طور سے یہ نسخے اب نہیں ملتے ہیں۔ مصر کے احمد عبد الرحمن علی الخربانی کے نام سے اس کو ابواب پر مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ اس میں

کا اختصار ہے جسے سراج الدین عمر اور زین الدین عمر نے مرتب کیا ہے۔ عقود الزبد علامہ سیوطی نے حروف معجم پر تیار کیا غزالی المستند ابو عمر محمد بن عبد الواحد کی تالیف ہے۔ ابوالحسن علی بن ابوبکر ہاشمی نے اس کو چھ جلدوں میں ابواب پر مرتب کیا۔ اس کے علاوہ بھی بعض دوسرے لوگوں نے شرحیں لکھی ہیں اس کے رجال کی فہرست تیار کی ہے اور اس سے معلق کتابیں لکھی ہیں۔

## امام بخاری

(ولادت ۱۹۴ھ - وفات ۲۵۶ھ)

ان کا نام محمد اور کنیت ابو عبد اللہ ہے، ان کی ولادت بخارا میں شوال ۱۹۴ھ میں ہوئی۔ امام صاحب کے دادا مغیرہ اس زمانہ میں پہلے فرد تھے جنہوں نے اسلام قبول کیا، مغیرہ کے والد بروزہ اس تھے۔ پرانے زمانے کا دستور تھا کہ جس شخص کے ہاتھ پر ایمان ہوتے اسی کی نسبت سے مشہور ہوتے، امام صاحب کے دادا بخارا کے امیر میان جہنی کے ہاتھوں مسلمان ہوئے تھے اسی لیے علی مشہور ہوئے اور اس وجہ سے امام صاحب کو بھی بعض لوگ جہنی کہتے ہیں۔ امام صاحب کے والد کا نام اسماعیل اور کنیت ابوالحسن ہے۔ ان کا شمار بخارا کے مشہور اہل علم میں ہوتا تھا، علمائے ان کا دار مستقر مدین میں کیا ہے۔ امام صاحب کی پیدائش کے تھوڑے ہی دن بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ امام صاحب کی والدہ ان کو اور ان

کے بڑے بھائی احمد کو بخارا سے مکہ معظمہ لے آئیں تاکہ تعلیم و تربیت بہتر طریقے پر کر سکیں۔

امام صاحب یمن ہی سے اچھے ذہن اور عمدہ حافظہ کے مالک تھے۔ ابتدا میں انھوں نے فقہ کی جانب توجہ رکھی اور اس سے فراغت کے بعد علم حدیث کی طرف توجہ کی، اس وقت تک مشافہہ احادیث کو مسانید میں بیچ گیا جاکھٹا اور علماء راہی کو سامنے رکھ کر درس و تدریس کا کام کرتے تھے۔ امام صاحب کے اس سفر کے سلسلے میں تفصیل تو نہیں معلوم ہو سکی لیکن جن لوگوں کا پتا چلتا ہے اس نہر میں سب سے زیادہ اہمیت اسحاق بن راہویہ اور علی بن المدینی کو حاصل ہے ان دونوں نے امام صاحب کے ذہن پر کافی اثر چھوڑا، جن دوسرے اساتذہ کے ناموں کا پتا چلتا ہے ان میں ابو عاصم، عمر بن عبد اللہ، قتیبہ بن سعید، احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین وغیرہ شامل ہیں۔

امام بخاری نے چھوٹی عمر ہی سے احادیث کو جمع کرنا شروع کر دیا تھا۔ ایک روز اپنے استاد اسحاق بن راہویہ کے درس میں حاضر تھے کہ وہاں حدیث کی بیچ و تدوین کا ذکر نکل آیا، استاد نے تمام شاگردوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ کاش کوئی ایسی کتاب مرتب ہو جاتی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مستند اور صحیح احادیث پر مشتمل ہوتی ہو۔ یہ سننا مطلب عام تھا لیکن امام صاحب کے دل پر نقش ہو گیا اور اسی وقت سے کوشش میں مصروف ہو گئے۔ امام صاحب بڑے ذہین تھے جو حدیث سننے فوراً یاد ہو جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ابتدائے

حیات کے زیادہ قائل نہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ بچنے سے انسان کی علمی قابلیت کم ہو جاتی ہے اور اپنے آپ سے اعتماد اٹھ جاتا ہے۔ لیکن پھر جب ان کو خود اپنی جامع کو مرتب کرنا ہوا تو یہ رائے بدلنی لگی، علم تقویٰ اور پرہیزگاری میں بڑا انجام مرتبہ رکھتے تھے۔

امام صاحب جس مجلس درس میں شریک ہوتے اپنی ذہانت و رعایتوں کی پرکھ سے اپنا وقار قائم کر لیتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شہرت بہت جلد دور دور تک پہنچ گئی تھی۔ ان کو بے شمار احادیث یاد تھیں۔ ان کی علمیت اور حافظہ کے اس دور کے بڑے بڑے محدثین قائل تھے اور جب امام صاحب کسی بزرگ کے مجموعہ احادیث کی صحت کی تصدیق کر دیتے تو وہ اس کو بطور سند پیش کرتے تھے تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد لوگ ان کے پاس حدیث سننے کے لیے آئے گئے۔ امام صاحب کی علمیت اور عظمت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ایک بار آپ بصرہ تشریف لے گئے تو وہاں کی جامع مسجد میں ایک بہت بڑا اجتماع ہوا جس میں بہت بڑے بڑے علماء اور حفاظ حدیث شریک ہوئے۔ امام صاحب سے درخواست کی گئی کہ وہ حدیث سے مشغول کچھ ارشاد فرمائیں، آپ نے لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اے علماء بصرہ آج میں تمہارے سامنے وہ حدیث پیش کروں گا جن کے راوی اسی شہر بصرہ کے رہنے والے ہیں مگر تم لوگ ان سے واقف نہیں ہو۔ اس

نے ان لوگوں سے کہا کہ تم لوگوں نے جو کچھ بوجھے دکھاؤ۔ جب ان لوگوں نے اپنی تحریریں دکھائیں تو امام صاحب ان کے علاوہ ہندو ہزار حدیثیں ان لوگوں کو ایسی سنائیں جو ان لوگوں کی تحریریں نہ دیکھ سکی تھیں۔

امام صاحب نے حدیثوں کو ان کے اصل راویوں سے سننے اور جمع کرنے کے لیے دور دراز کے سفر کیے۔ متعدد بار مصر، حجاز اور بصرہ گئے، ان جگہوں پر خاص مدت تک قیام کیا اور جن بزرگوں سے کتب نہیں کر سکتے تھے پوری توجہ کے ساتھ کیا۔ اس زمانے میں نیشاپور علم حدیث کے اہم مراکز میں شمار ہوتا تھا، اس فن کے اہم لوگ یہاں درس و تدریس میں مصروف تھے۔ امام مسلم کے استاد امام محمد بن یحییٰ ذہبی جیسے مشہور محدث کے علم و فضل کا شہرہ تھا۔ امام بخاری نے بھی نیشاپور کا سفر کیا۔ جب آپ نیشاپور پہنچے تو آپ کا شان دار استقبال ہوا، لوگ شہر سے باہر نکل آئے اور انتہائی تکریم و تکریم کے ساتھ آپ کو ساتھ لے گئے۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ آپ استقبال بڑے بڑے امراء و سلاطین کو بھی نصیب نہ ہوا ہوگا۔

امام صاحب نے یہاں کچھ دن قیام کیا اور حدیث کا درس دینے لگے۔ ان کی مجلس درس میں شہر اور قرب و قریب کے اہم علماء اور حدیث سے دل چسپی رکھنے والے حضرات شریک ہوتے اور فیض اٹھاتے، امام ذہبی کے شاگرد خاص اور امام بخاری کے ہم عصر وہم پتہ امام مسلم بھی ان کی مجلس میں بہت دل چسپی کے ساتھ شریک ہوتے۔ امام ذہبی نے اپنے تمام شاگردوں کو حکم دے رکھا تھا کہ امام بخاری کی مجلس میں

کے بعد آپ نے بہت سی حدیثیں لوگوں کو سنائیں جن کے سب رواۃ بصرہ ہی کے رہنے والے تھے۔

ان کی غیر معمولی یادداشت کے سلسلے میں یہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ جب آپ بغداد تشریف لے گئے تو وہاں کے محدثین نے آپ کو امتحان لینا چاہا۔ اس مقصد کے لیے ان لوگوں نے سو حدیثیں منتخب کیں اور ان کی اسناد و متون کو الٹ پلٹ کر مختلف لوگوں کے سپرد کیا کہ اسی طرح سے امام صاحب کے سامنے پیش کریں۔ ان لوگوں نے اسی طرح سے وہ حدیثیں امام صاحب کو سنائیں، بہت سے لوگ اس موقع پر جمع تھے۔ امام صاحب ہر حدیث کو سن کر فرماتے میں اس سے واقف نہیں ہوں۔ جب اسی طرح سے تمام حدیثیں پیش ہو چکیں تو امام صاحب نے ان تمام احادیث کو صحیح متون و اسناد کے ساتھ لوگوں کو سنادیا۔ یہ زبانیت و قوت حافظہ کا اتنا بڑا کمال تھا کہ تمام لوگ دنگ رہ گئے اور آپ کے فضل کے قائل ہو گئے۔

ان کی قوت حافظہ کے سلسلے میں تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ بچپن میں اساتذہ کے درس حدیث میں شریک ہوتے، ان کے ساتھی حدیثیں کہتے تھے اور یہ محض سن کر یاد کرتے۔ کچھ دن بعد ان کے ساتھیوں نے ان سے پوچھا کہ تم حدیثیں کہتے نہیں ہو۔ ان کو کس طرح سے یاد رکھ سکو گے۔ امام صاحب

ہاں بخارا واپس روانہ ہوئے جب بخارا والوں کو بتا چلا کہ امام صاحب واپس آ رہے ہیں تو ان لوگوں نے بے حد خوشی و مسرت کا اظہار کیا۔ شہر سے باہر ان کا شاندار استقبال ہوا درہم و دینار ان پر سے ٹپا دئے گئے اور بڑی شان و شوکت اور کرم و تحسیم کے ساتھ شہر میں داخل ہوئے۔

وطن واپس آنے کے بعد کچھ دن سکون و اطمینان سے گزرے لیکن جلد ہی لوگوں نے والی بخارا کو ان کی طرف سے بدظن کر دیا اور اس نے ان کو بخارا سے نکل جانے کا حکم دیا۔ اس سلسلے میں ایک روایت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ والی بخارا نے خواہش ظاہر کی کہ امام صاحب اس کے بچوں کو حدیث و تاریخ کی تعلیم گھر کر دیں لیکن امام صاحب نے اسے غلطی کی توہین قرار دے کر انکار کر دیا۔ اس پر والی بخارا نے کہا کہ اگر یہ ممکن نہیں ہے تو پھر لڑکے خود امام صاحب کے پاس آجیا کریں مگر اس شرط کے ساتھ کہ اس وقت کوئی دوسرا طالب علم وہاں موجود نہ ہو۔ امام صاحب نے اس بات کو بھی قابل قبول نہ سمجھا۔ والی بخارا اسی وجہ سے آپ سے ناراض ہو گیا اور جلا وطنی کا حکم دیا۔ مجبوراً امام صاحب فرنگ چلے گئے یہاں ان کے رشتے دار رہتے تھے۔ امام صاحب کو اپنی کس پرستی کا شدت سے احساس تھا اور اکثر دعا کرتے تھے کہ اے اللہ زمین اپنی دوست کے باوجود میرے لیے تنگ ہوگئی ہے اب مجھ کو اٹھا لے۔

حاضر ہوا کریں ایک روز وہ خود بھی ان کی مجلس میں تشریف لے گئے۔ چونکہ امام بخاری کی آمد اور ان کے حلقہ درس کی وجہ سے دوسرے اساتذہ کے درس میں شرکاء کی تعداد گھٹ گئی تھی اس لیے امام ذہلی کو یہ خیال ہوا کہ کہیں ان کی موجودگی میں ان کا کوئی شاگرد امام بخاری سے کوئی ایسا سوال نہ پوچھ لے جس کی وجہ سے فقہ میں اور امام بخاری میں اختلاف ہو جائے اور دوسرے مذاہب کے لوگوں کو مذاق اڑانے کا موقع ملے۔ اس لیے انھوں نے تاکید کی کہ کوئی اختلافی مسئلہ سے متعلق کوئی سوال وہاں نہ کرے۔ لیکن اس کے باوجود اس مجلس میں ایک شخص نے امام بخاری سے سوال کیا کہ الفاظ قرآن کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے کیا وہ مخلوق ہیں۔ پہلے تو امام صاحب خاموش رہے لیکن جب اس شخص نے پھر اپنا سوال دہرایا تو امام صاحب نے جواب دیا کہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور غیر مخلوق ہے اور جو الفاظ ہمارے منہ سے نکلتے ہیں وہ ہمارے افعال ہیں اور ہمارے افعال مخلوق ہیں۔

بہر حال یہ ایک طویل بحث ہو سکتی تھی لیکن امام صاحب نے اسے بہت ہی مختصر انداز میں ختم کر دیا۔ اس مجلس میں جو لوگ اس عقیدے کے قائل تھے کہ قرآن مخلوق ہے ان لوگوں نے بڑا ہنگامہ کیا اور غوراً امام صاحب خانہ نے ان لوگوں کو وہاں سے ہٹا دیا۔ اس واقعے کے بعد امام صاحب کی ہر روزی میں قدرے کمی ہوگئی۔ خود امام ذہلی نے امام بخاری کے اس جواب کو پسند نہ کیا۔ جب اختلافات کی تسلیح و بیسج ہونے لگی تو امام بخاری نے نیشاپور سے رخصت سفر باندھا اور اپنے

اور کبھی اپنے گھر پر دیتے تھے۔ ان کے شاگردوں میں بہت سے مشہور لوگوں کے ساتھ ساتھ امام مسلم، امام ترمذی اور امام نسائی جیسے پائے کے محدثین بھی شامل تھے۔

امام صاحب کو تصنیف و تالیف کا شوق تھا، ان کی کتابوں کے جو نام ملتے ہیں ان میں سے کچھ کے نام درج ذیل ہیں:

الجامع الصحیح، الادب المفرد، رسالہ ریح المیدین، تاریخ کبیر، تاریخ اوسط، تاریخ صغیر، الجامع الکبیر، کتاب الضعفاء، التفسیر، الکبیر، کتاب البیوض، کتاب الاشرار، تفصیلاً الصحابہ، کتاب اعلیٰ، اسانی الصحابہ، کتاب المناقب وغیرہ۔

ان تمام کتابوں میں سب سے اہم، مشہور اور زائد جاوید تصنیف الجامع الصحیح ہے، اس کتاب کا پورا نام "الجامع الصحیح المسند من حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و مسند و امام" ہے۔ جیسا کہ اس کے نام سے اندازہ ہوتا ہے اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال احوال سند و متن کی صحت کے ساتھ جمع کیے گئے ہیں۔ امام صاحب نے اس جامع کو سولہ سال کی مدت میں مرتب کیا، یہ چھ لاکھ حدیثوں سے منتخب ہے۔ اس میں امام صاحب نے انھیں احادیث کو ایسا ہے جن کی صحت ان کے مقرر کردہ اصولوں سے ثابت ہوتی تھی ہر حدیث کو شامل کرنے سے پہلے استخارہ کرتے، دو رکعت نماز پڑھتے اور جب اس کی صحت پر قلب مطمئن ہو جاتا تو کھ لیتے بعض لوگ کہتے ہیں کہ آپ نے اسے بخاری میں لکھا، بعض کا خیال ہے کہ بصرہ میں اور بعض کہتے ہیں کہ کثر میں، غالباً اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ اس کی تالیف

آخر ان کی دعا مقبول ہوئی اور ۲۵۶ھ میں باسٹھ سال کی عمر میں عید الفطر کی رات کو انتقال کر گئے۔ عید کے دن بعد نماز ظہر تہنیت ہوئی بلکہ ان کے انتقال کی خبر سے علماء و اعیان علم کی مجلسوں میں غم و اندوہ کی لہر پھیل گئی۔

امام صاحب کے مزاج میں خود داری اور استغناء بدرجہ اتم موجود تھا، اس سلسلے میں ایک واقعہ اور پر گزر چکا ہے کہ انھوں نے جلا وطنی کو پسند کیا لیکن یہ بات گوارا نہ کی کہ ظلم کو امرار دسلاطین کے احکامات کا اہنہ کر سوں۔ ان کے حالات زندگی سے اس بات کا بھی پتا چلتا ہے کہ دنیا دار علماء کی طرح سے انھوں نے امرار اور بادشاہوں کی سرپرستی کو قبول نہ کیا، ان کی زندگی میں بڑی بڑائی کے دور آئے مگر وہ ہمیشہ ثابت قدم رہے اور تقاضات پسندی و سادگی کے ساتھ زندگی گزار دی۔ امام صاحب اپنا روپیہ و درشن کو تجارت کے لیے دیتے تھے اور اسی کے نفع سے عام طور سے اپنی زندگی کے اخراجات پورے کرتے تھے۔ امام صاحب کو ان کی زندگی ہی میں غیر معمولی شہرت و عزت حاصل ہوئی لیکن اس کے باوجود ان کو اپنے علم پر کسی قسم کا فخر نہ تھا، اگر کسی مسئلے کا علم ہوتا تو بلا تکلف اپنی لاعلمی کو تسلیم کر لیتے اور پھر اسے دوسروں سے دریافت کرتے۔ ان کا حلقہ درس بہت وسیع تھا، دور دور سے لوگ ان کے درس میں شرکت کے لیے آتے، درس بھی صبر میں

میں باقاعدہ توجہ کی ضرورت ہے اور پھر اس مقصد کے تحت انہوں نے اپنی جامع کو مرتب کرنا شروع کیا۔ چونکہ امام صاحب کا مقصد صرف یہ نہ تھا کہ حدیثیں جمع کر دی جائیں بلکہ وہ کمرے کھائے کو بھی اکٹھا کرنا چاہتے تھے، علت وضعت سے بھی بحث کرنا چاہتے تھے صحت کے ساتھ ساتھ نظم و ترتیب کی طرف بھی ان کی توجہ تھی۔ اس لیے قدرتی طور پر ان کا کام زیادہ مشکل تھا اور یہی وجہ ہے کہ اس میں وقت بھی زیادہ لگا۔

امام صاحب نے اپنی صحیح میں نو ہزار بیاسی (۹۰۸۲) احادیث بیان کی ہیں جو چھ لاکھ (۶۰۰۰۰) حدیثوں سے منتخب کی گئی ہیں۔ اس میں ایک سو ساٹھ (۱۶۰) کتاب اور تین ہزار چار سو پچاس (۲۴۵۰) ابواب ہیں۔ اس میں بائیس (۲۲) ایسی احادیث ہیں جو حضرت تین واسطوں سے امام صاحب تک پہنچی ہیں۔ ان پر امام بخاری کو کفر ہے۔ امام صاحب نے پہلے تو صرف احادیث کو جمع کیا۔ اس کے بعد ان کو تنقیدی نظر سے گزرا، اصول و قواعد مرتب کیے، حدیث کے درجے مقرر کیے اور اس بات کی پوری کوشش کی کہ اس میں صرف صحیح اور انتہائی معتبر حدیثوں کو جو ہر لحاظ سے تنقید کے میسر پر پوری آئیں، شامل کیا جائے۔ امام صاحب کا یہی سب سے بڑا امتیاز اور ان کی اہمیت ہے کہ انہوں نے اعلا اصولوں اور صحت

ترتیب میں خاصی مدت لگی اور امام صاحب نے اس زمانے میں مختلف جگہوں کے سفر کیے اور اسے ساتھ رکھا، اس لیے لوگوں کو یہ خیال پیدا ہو گیا۔

اس کتاب کی وجہ تالیف کے سلسلے میں خود امام صاحب کی یہ روایت بہت مشہور ہے کہ ایک روز انہوں نے خواب دیکھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں اور یہ دیکھا ہے ان کی کھچیاں جھل رہے ہیں۔ بیدار ہونے پر آپ نے لوگوں سے اس کی تعبیر دریافت کی تو لوگوں نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جو جو احادیث منسوب ہے تم اسے رنج کر دو گے۔ امام صاحب کے ذہن میں اپنے استاد اسحاق بن راہویہ کی خواہش کہ احادیث صحیحہ کا ایک مجموعہ مرتب ہو جائے پہلے سے موجود تھی، اس خواب نے اس عزم و ارادے کو مزید تقویت بخشی اور وہ اس کام میں لگ گئے۔

امام بخاری کے زمانے تک حدیث کے متعدد مجموعے مرتب ہو چکے تھے، جن بزرگوں نے اس سلسلے میں بڑی محنت و کاوش سے کام کیا تھا ان میں امام مالک، ابن جریج، امام اوزاعی، سفیان ثوری، نعیم بن حماد اور ابوسلمہ وغیرہ کے اسمائے گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان بزرگوں نے جس قدر بھی سرمایہ حدیث ممکن تھا بڑی تلاش و جستجو کے بعد مرتب کر دیا تھا۔ عام طور سے اس وقت جو جو ملے تھے ان میں ہر قسم کی حدیثیں موجود تھیں، بہت سے لوگوں نے صحیح و غلط کی بھی زیادہ فکر نہ کی تھی، جب امام بخاری نے اس قسم کے تمام نسخوں پر نظر ڈالی تو ان کو اندازہ ہوا کہ اس سلسلے

لے ایسی حدیثوں کو اصطلاح میں ثلثیات کہا جاتا ہے۔ اس کو سند عال بھی کہتے ہیں اور یہ ہر اعتبار سے امتیازی اور اہم سمجھی گئی ہیں۔

کے بلند ترین معیار کو سامنے رکھ کر وہ مجروح تیار کیا جسے امت مسلمہ نے منفق طور پر "صحیح کتاب بعد کتاب اللہ" (اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن مجید) کے بعد سب سے زیادہ صحیح کتاب تسلیم کیا۔ صحیح بخاری کی مقبولیت کے سلسلے میں ابو زید مردازی کا دواقہ بھی قابل ذکر ہے، کہتے ہیں کہ میں ایک دن حرم میں سو رہا تھا کہ خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی، حضور فرما رہے تھے کہ تم ہماری کتاب کیوں نہیں پڑھتے، میں نے پوچھا حضور کی کتاب کون سی ہے، فرمایا صحیح بخاری پلے۔

جب امام بخاری نے اس کی ترتیب مکمل کر لی تو امام احمد بن حنبل (۲۴۱ھ = ۸۵۵ء) یحییٰ بن معین (۲۴۳ھ) اور علی بن المدینی (۲۴۴ھ) کے سامنے پیش کیا یہ لوگ امام صاحب کے اساتذہ میں سے تھے، ان لوگوں نے اس کام کی تعریف کی اور اس کی صحت و افضلیت کا اعتراف کیا، شاہ دولہ اللہ نے لکھا ہے کہ جو شخص صحیح بخاری کی عظمت کا قائل نہ ہو وہ مسلمانوں کی راہ کے خلاف چلتا ہے۔ علامہ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ بخاری شریف کے پڑھنے سے بہت سے نافرمان ہیں، خط سالی دور ہوتی ہے اور اس کی برکت سے بارش ہوتی ہے۔ بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ اس کے بار بار پڑھنے سے دعائیں مقبول ہوتی ہیں اور کام پورے ہوتے ہیں۔

امام صاحب نے اس کتاب میں صرف صحیح حدیثوں کو شامل

کیا ہے، فقہی مسائل کی طرف بھی توجہ رکھی ہے۔ آیات احکام کا بھی بال رکھا ہے۔ اس سے ایک طرف فقہی مسائل کی توضیح ہوتی ہے دوسری طرف تفسیری و تاریخی نکتے بھی ملتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب حدیث کے دوسرے مجموعوں میں ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں بہت سی حدیثوں کی تکرار ملتی ہے یعنی ایک ہی حدیث مختلف ابواب میں نظر آتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک ہی حدیث سے مختلف مسائل یا احکام کا پتا چلتا ہے، چونکہ انھوں نے مختلف قسم کے ابواب قائم کیے ہیں اس لیے وہ حدیث جن جن ابواب سے متعلق ہے ان میں اس کا ذکر کرتے ہیں، البتہ اکثر جگہوں پر اس کا خیال رکھا ہے کہ اس کی اسناد مختلف ہوں، ایک ہی حدیث کو مختلف سندوں سے بیان کرنے میں یہ بات بھی ان کے پیش نظر ہے کہ اس سے حدیث کو تقویت ملتی ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک راوی کسی حدیث کو مختصر طریقے پر بیان کرتا ہے اور دوسرا مفصل، کبھی مختلف راوی ایک ہی حدیث میں الگ الگ الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اچھے محدث کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ ایسی احادیث کے مختلف سلسلوں کو ضرور بیان کرتا ہے تاکہ سننے والے مشکوک و شبہات میں مبتلا نہ ہوں اور الفاظ حدیث کے صحیح مفہوم کو سمجھ سکیں اور اس کی تشریح و تنقید آسانی سے کر سکیں۔

امام بخاری نے بعض احادیث کے الگ الگ حصے مختلف ابواب میں پیش کیے ہیں اس پر بعض لوگوں نے اعتراض کیا ہے اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ بہت سی احادیث ایسی ہیں جن کے



حدیث کی صحیح ترین کتاب میں چھ بھی جاتی ہیں جنہیں صحاح ستہ کہتے ہیں، مگر ان میں بھی دو کتابیں زیادہ قابل اعتبار اور صحیح تسلیم کی گئی ہیں: ۱۱۱ صحیح بخاری اور ۱۲۲ صحیح مسلم۔ عام طور سے ان کو صحیحین کہا جاتا ہے، لیکن علماء نے ان دونوں میں بخاری کو اصح مانا ہے اور اس کی وجوہات یہ بیان کی ہیں کہ یہ اپنے انداز کی پہلی تصنیف ہے، چونکہ امام بخاری کے سامنے کوئی نمونہ نہ تھا اس لیے ان کو اہل کاشف حاصل ہے، امام مسلم کے سامنے نقش اول موجود تھا اس میں جو عمومی قسم کی خامیاں رہ گئی تھیں وہ ان سے بچ گئے، امام بخاری نے اس کا التزام کیا کہ صرف صحیح حدیثوں کو جمع کریں اور ان کی ترتیب فقہی مباحث کے پیش نظر کی، اس سلسلے میں کسی باب میں آیات قرآنی پیش کر کے استدلال کیا ہے اور حدیثیں جمع کی ہیں، اس سے تحقیق سائل میں بھی بہت ملتی ہے، امام بخاری نے کچھ ایسی احادیث بھی پیش کی ہیں جن سے اس زمانے کی معاشرت کا بھی پتا چلتا ہے۔ بعض جگہوں پر ایک ہی حدیث سے مختلف نتائج نکالے ہیں، مثلاً ایک حدیث ہے کہ حضرت عائشہؓ کی لونڈی بریرہؓ کو کسی نے گوشت صدقہ کے طور پر دیا، حضرت عائشہؓ نے وہ گوشت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہہ کر نہیں دیا کہ یہ صدقہ کا ہے اور آپ صدقہ نہیں کھاتے، آپؐ نے فرمایا کہ یہ بریرہؓ کے لیے صدقہ ہے لیکن اگر وہ شے دے دے تو یہ میرے لیے میرے ہوگا۔ امام بخاری نے اسے مختلف ابواب میں نقل کیا ہے، ایک جگہ اس سے یہ استدلال کیا ہے کہ ان لوگوں پر صدقہ حرام ہے ان کی لونڈیاں صدقہ لے سکتی ہیں، دوسری

الفاظ سے الگ الگ سائل اور احکام مستنبط ہوتے ہیں، اسی لیے امام صاحب نے ایسی احادیث کے حصے مختلف سندوں سے الگ الگ ابواب میں بیان کر دیے تاکہ ان سے ایک طرف تو متعدد املاء کا پتا چل جائے اور دوسری طرف اس کے متعدد مفہوم بھی معلوم ہو جائیں۔

ایک اعتراض یہ بھی کیا گیا ہے کہ بعض جگہوں پر اس کی ترتیب میں بے ربط اور ابواب میں غامبی نظر آتی ہے۔ مولانا عبدالرشید نعمانی اس کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اگرچہ کتاب سولہ سال کی مدت میں تمام ہو گئی تھی مگر نظر ثانی اور اضافے کا سلسلہ اخیر دم تک جاری رہا، بعض مقامات پر امام مدوح نے اضافہ کرنا چاہا تھا مگر اس کا موقع نہ مل سکا، چنانچہ کہیں باب قائم کر دیا تھا مگر اس کے تحت حدیث درج کرنے کی نوبت نہ آئی، کہیں حدیث لکھ لی تھی مگر باقی کم نہ کر سکے تھے، بہر حال کتاب کے بہت سے مقامات اسی طرح تشہد تکمیل ہی تھے کہ امام بخاری نے اس دار فانی سے عالم جاودانی کو رحلت فرمائی، بعد کو ناخین نے اپنی صوابدید کے مطابق جن ابواب میں چاہا ان حدیثوں کو نقل کر دیا۔" لہ

جگہ اسی حدیث سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اگر کسی کو صدقہ دیا جائے اور وہ اس صدقے کو بطور ہدیہ کسی ایسے شخص کو پیش کرے جس پر صدمہ حرام ہے تو اس کا شمار ہدیہ میں ہوگا صدقے میں نہیں۔ غرض اسی طرح سے اور بھی بہت سی حدیثوں سے الگ الگ نتائج اخذ کیے ہیں۔ بعض لوگوں نے بخاری کی جوہوں میں حدیث کے ادنیٰ رنگ کو بھی شمار کیا ہے، حدیث کی دوسری کتابوں کے مقابلے میں بخاری میں حدیث کے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور جو اس کا طرز بیان ہے وہ زیادہ سلیس اور ادبی ہے اور خاص طور سے اس زبان کے مطابق ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یا اس سے قریب کے زمانے میں رائج تھی۔ امام صاحب ان احادیث کو صحیح تسلیم نہیں کرتے جن کے راویوں کی ایک دوسرے سے ملاقات ثابت نہ ہو جب کہ دوسرے محدثین کے نزدیک ہم عصر ہونا کافی ہے۔ بہر حال امام صاحب کی تخت، دیانت، احتیاط، صحت روایت، اتصال اسناد اور اسی قسم کی بنا پر علماء وفقہاء ان حدیث نے بڑی قدر و منزلت کی اور ان کی صحیح کو اصح کتاب بعد کتاب اللہ کا اونچا درجہ دیا۔

صحیح بخاری کی مقبولیت اور اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ علماء ہر دور میں اس کی شرحیں اور حواشی لکھتے رہے جن کی تعداد سو سے زائد ہے۔ ان میں سے چند اہم اور مشہور درج ذیل ہیں:

۱۔ فتح الباری: حیر متوفی ۸۵۲ھ میں۔ یہ کتاب بہت مفصل اور مدلل سمجھی جاتی ہے۔ ابتدا میں بہت تفصیل سے امام بخاری

۲۔ عمدۃ القاری: متوفی ۸۵۵ھ کی تصنیف ہے۔ اس میں مصنف نے فتح الباری سے پوری طرح استفادہ کیا ہے اور جو باتیں اس میں آسکی تھیں ان کو بھی بیان کیا ہے۔ ان دونوں کتابوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ فتح الباری کا مقدمہ بہت بسوط اور مفصل ہے جس سے فن حدیث کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور عمدۃ القاری کی تشریحات و توضیحات ایسی مدلل اور عمدہ ہیں کہ حدیث کا مطلب اور متعلقہ مسئلہ پوری طرح سمجھ میں آجاتا ہے اور کسی دوسری شرح کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اس کے مصنف علامہ عینی فتح الباری کے مصنف ابن حجر سے عمر میں حنا سے بڑے اور ان کے اساتذہ کے درجے کے بزرگ تھے۔

۳۔ ارشاد الباری: اس کے مصنف احمد بن محمد الخلیل القسطلانی متوفی ۹۲۳ھ میں۔

۴۔ ہدایت الباری: علامہ زکریا انصاری متوفی ۹۲۸ھ کی تصنیف ہے۔

۵۔ تیسیر القاری: علامہ نور الحق بن عبدالحق دہلوی متوفی ۱۰۴۳ھ کی تصنیف ہے، فارسی زبان میں۔

زبان میں۔

۶۔ التوثیخ علی الجامع الصحیح: علامہ جلال الدین السیوطی  
ان کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگوں نے شرح و تراشی کی  
رجال، بخاری اور مسلمات بخاری پر کام کیا ہے۔ اس کے اختصار بھی  
لوگوں نے کیے ہیں جو بہت مقبول ہیں۔ عربی کے علاوہ فارسی، اردو، انگریزی  
اور دوسری زبانوں میں بہت سی شرحیں اور ترجمے بھی کیے گئے۔

## امام مسلم

(ولادت ۲۰۶ھ - وفات ۲۶۱ھ)

مسلم بن حجاج بن مسلم کی پیدائش نیشاپور میں ہوئی، ان کا مسلک  
بہ عرب کے خاندان بنی قشیر سے ملتا ہے۔ ان کے سہ پیدائش میں  
خلافت ہے۔ مؤرخین نے ۲۰۲ھ، ۲۰۴ھ اور ۲۰۶ھ لکھا ہے۔ علامہ  
ذہبی نے ۲۰۴ھ کو صحیح کہا ہے، ابن خلکان اور ابن اثیر نے ۲۰۶ھ لکھا  
ہے۔ امام مسلم بڑے ذہین تھے، بچپن ہی سے ان کو علم حدیث سے  
اپنی پس مندی، نیشاپور اس زمانے میں مرکزی حیثیت رکھتا تھا اور  
اسے بڑے علماء و محدثین وہاں موجود تھے۔ امام مسلم نے بھی ان مشائخ  
کیا پس درس سے فائدہ اٹھایا اور پوری توجہ دیکھنے سے اس مبارک  
مرکز تحصیل میں گات گئے۔ نیشاپور کے اساتذہ سے فیض اٹھانے کے

بعد متعدد دوسرے شہروں کا بھی سفر کیا اور شہر و علماء سے تلمذ کیا۔ ان کے بچپن اور طالب علمی کے حالات کا تفصیل سے پتا نہیں چلتا ہے اور نہ ہی اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ابتدائی اساتذہ کون تھے، موزنین نے ان کے اساتذہ میں محمد بن یحییٰ ذہلی، سعید بن منصور، احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، عبد اللہ بن مسلمہ، قعنبی، اسماعیل بن ابی ادیس، عمرو بن سواد وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ تمام اساتذہ مصر، بغداد، بصرہ، حجاز وغیرہ میں تھے اور امام مسلم نے ان لوگوں کی خدمت میں حاضر ہو کر کسب فیض کیا تھا۔ نیشاپور میں امام بخاری سے بھی فیض اٹھایا تھا۔

امام مسلم سے بے شمار لوگوں نے حدیث کا سماع کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان سے روایت کرنے والوں کی تعداد بہت بڑی ہے، ان میں سے چند کے نام یہ ہیں: ابو الفضل احمد بن سلمہ، محمد بن عبد الوہاب، ابو عمرو مستملی، صالح بن عبد، ابراہیم بن ابی طالب، علی بن حسین، ابن خریز، ابو عبد بن ابی حاتم الرازی، ابراہیم بن محمد بن سفیان، ابو عواز اسرافانی، محمد بن اسحاق فاکہی، امام ترمذی وغیرہ۔

امام مسلم اپنے مزاج کے اعتبار سے صلح پسند، ایمان دار، حق گو، اخلاق و شرافت میں بے مثال تھے، غیبت، تغلی اور سب و شتم سے ان کا دامن ہمیشہ پاک رہا۔ شاہ عبدالعزیز نے لکھا ہے:

”مسلم کے عجائبات میں سے ایک یہ ہے کہ آپ نے عمر بھر کسی کی غیبت نہیں کی نہ کسی کو مارا اور نہ کسی کو گالی دی۔“

جاتی ہے کہ امام بخاری کی بہت سی روایتیں اہل شام کی کتابوں کی گئی ہیں، خود محدثین کی زبان سے نہیں سنی گئی ہیں۔ اس لیے ان کے راویوں میں امام بخاری سے کبھی کبھی غلطی ہو جاتی ہے، ایک ہی راوی کہیں اپنی کینیت سے اور کہیں اپنے نام سے آجاتا ہے، امام بخاری اس کو دو الگ الگ اشخاص سمجھ لیتے ہیں، لیکن امام مسلم کے یہاں ایسی غلطی نہیں ہونے پاتی، اس لیے کہ وہ براہ راست خود سنی ہوئی حدیثوں کو نقل کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ امام مسلم نے یہ شرط لگائی ہے کہ وہ اپنی صحیح میں صرف وہ حدیث بیان کریں گے جس کو کم از کم دو ثقہ تابعین نے دو صحابیوں سے روایت کیا ہو اور یہی شرط تمام طبقات تابعین و تبع تابعین میں ملحوظ رکھی ہے، دوسرے یہ کہ وہ راویوں کے اوصاف میں صرف عدالت پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ شہادت کی شرائط کو ملحوظ رکھتے ہیں، بخاری کے یہاں اس قدر پابندی نہیں ہے۔  
امام مسلم کی وفات کا سبب بھی ان کے محققانہ مزاج تلاش و جستجو کی عکاسی کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک روز آپ سے کوئی حدیث دریافت کی گئی، آپ کو اس وقت صحیح طور پر یاد نہ تھی اس لیے نہ بتائے، گھر آکر اپنی کتابوں میں اس کی تلاش کرنے لگے۔ کچھ روزوں کا ٹوکرا قریب ہی رکھا تھا، تلاش حدیث کے ساتھ ساتھ

امام مسلم کے زمانے میں علم حدیث کی طرف لوگوں کی توجہ زیادہ تھی اور یہ توجہ مذہبی رنگ میں رہی ہوئی تھی، اس زمانے میں فن حدیث کے بہت سے اساتذہ موجود تھے۔ امام صاحب نے سب ہی سے استفادہ کیا اور جلد ہی وہ وقت بھی آگیا جب ان کا اپنے ہمعصروں میں ایک خاص مرتبہ ہو گیا، بہت سے اساتذہ نے بھی ان کی فضیلت، علمیت، کمال اور اعلا ذاتی صلاحیتوں کا اعتراف کیا اور ان سے روایت کی ہے، اسحاق بن راہویہ نے جو علم حدیث کے امام تھے ان کے متعلق پیشین گوئی کی:

”خدا جانے یہ شخص کس شان کا ہوگا۔“

ان کے اساتذہ اور معاصرین نے ان کے کمالات کو بے حد سراہا اور ہمیشہ قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھا۔ ابو عمر دمشقی کہتے ہیں کہ اسحاق بن منصور حدیثیں لکھوا رہے تھے اور امام مسلم ان میں سے انتخاب کر رہے تھے، اچانک امام اسحاق نے نظر اوپر اٹھائی اور فرمایا جب تک مسلم بن حجاج ہمارے پاس ہیں ہم کبھی خیر سے محروم نہ ہوں گے۔ ان کے ایک دوسرے استاد محمد بن عبد الوہاب کہتے تھے کہ مسلم علم کا خزانہ ہیں، ابو جریر جاردی امام مسلم کو علم کا محافظ قرار دیتے تھے۔ امام ابو زرعہ اور ابو حاتم رازی جیسے بزرگ ان کو اس زمانے کے دوسرے شیوخ پر ترجیح دیتے تھے۔

امام مسلم فن حدیث میں غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے، احادیث کے کھرے کھوٹے کی پہچان میں ان کو مہارت تھی، بعض لوگوں نے امام مسلم کو امام بخاری پر ترجیح دی ہے، اس کی وجہ یہ بیان کی

۱۔ اس کو فن حدیث کی اصطلاح میں منادر کہتے ہیں۔ مہ ذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۳۷  
۲۔ بہستان المحدثین اردو ص ۱۳۷

- ۱- کتاب مشائخ شہبہ  
۱۱- کتاب سوالات احمد بن حنبل  
۱۲- کتاب حدیث عمرو بن شعیب  
۱۳- کتاب مناقب باب اسباب  
۱۴- کتاب منہج لاراد واحد  
۱۵- کتاب اولاد الصالحین  
۱۶- کتاب طبقات التابعین  
۱۷- مسند امام مالک  
۱۸- کتاب منہج لاراد واحد  
۱۹- مسند امام مالک

امام مسلم کی یہ تمام کتابیں اپنی جگہ پر مفید اور اچھی ہیں، لیکن ان سب میں جو شہرت اور قبول عام ان کی انجامت اربعہ کو حاصل ہوا کسی دوسری تصنیف کو نہ ہو سکتا۔ صحاح ستہ میں اس کو عام طور سے دوسرا درجہ حاصل ہے، لیکن بعض علماء نے اسے صحیح بخاری پر ترجیح دی ہے، حافظ ابوالعلیٰ حاکم نیشاپوری ان کی اس تصنیف کو حدیث کی تمام دوسری کتابوں پر ترجیح دیتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ روئے زمین پر صحیح مسلم سے بڑھ کر کوئی اور صحیح کتاب نہیں ہے۔ امام نسائی، مسلم بن قاسم اور ابو یوسف اسماعیل وغیرہ بھی مسلم کو زیادہ بہتر قرار دیتے تھے۔ لیکن چہرہ امت نے امام بخاری کی صحیح کو امام مسلم کی صحیح پر فوقیت دی ہے اور اس کی بنیاد ہی وجہ یہ قرار دی ہے کہ جس وقت امام بخاری نے یہ کام کیا تھا اس وقت ان کے سامنے کوئی نمونہ نہ تھا۔ اور انھوں نے تمام صحیح روایات کو یکجا کر کے انھیں برباد ہونے سے بچایا۔ امام مسلم کے سامنے امام بخاری کی صحیح موجود تھی اور ان کو اس

آپ کچھ بھی کھاتے جا رہے تھے، ان پر کچھ ایسی دھن اور انہماک و استغراق طاری تھا کہ یہ اندازہ ہی نہ ہو کہ کب وہ نوکر اخالی ہو گیا غیر ارادی طور پر کچھ روں کا اتنی زیادہ مقدار میں کھا جانا ان کی موت کا سبب بن گیا اور ۲۵ رجب ۲۶۱ھ میں جان جان آفریں کے سپرد کر دی، نیشاپور کے قریب نصیر آباد میں دفن ہوئے۔ ابوہام رازی کہتے ہیں کہ میں نے امام مسلم کو خواب میں دیکھا اور ان کا حال پوچھا تو انھوں نے جواب دیا اللہ تعالیٰ نے اپنی جنت کو میرے لیے مباح کر دیا ہے جہاں چاہتا ہوں رہتا ہوں۔

امام مسلم کو حدیث کی تلاش و جستجو اور راویان حدیث سے ملاقات کے لیے مختلف جگہوں کے سفر کرنے پڑے لیکن اس کے باوجود وہ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں بھی برابر لگے رہے، ایک طرف ان کے بہت سے شاگردوں کا پتا چلتا ہے جنہوں نے ان کے نام کو اونچا کیا اور حدیث کی خدمت کی دوسری طرف ان کی بہت سی تصانیف کا بھی ذکر ملتا ہے۔ مورخین نے ان کی مندرجہ ذیل کتابوں کا ذکر کیا ہے:

- ۱- انجامت اربعہ  
۲- کتاب السنن  
۳- کتاب الجامع علی الباب  
۴- کتاب الایمان والکفی  
۵- کتاب الایمان والکفی  
۶- کتاب منہج لاراد واحد  
۷- کتاب منہج لاراد واحد  
۸- کتاب منہج لاراد واحد

کو مرتب کیا احادیث موضوع کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا غالباً ہی وجہ ہے کہ امام صاحب نے اس کتاب کے شروع میں ایک مقدمہ لکھا جس میں اصول حدیث اور جرح و تعدیل سے متعلق بڑی اہم باتیں پیش کی ہیں۔ کتاب کی ترتیب ابواب کے تحت کی ہے اور ہر باب میں اس سے متعلق احادیث کو جمع کیا ہے۔ امام صاحب نے اپنی تصحیح میں حدیث لکھنے کی یہ شرط رکھی ہے کہ تمام راوی عادل، ثقہ، متصل اور علت سے پاک ہوں۔ شیخ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ رہے ہوں اور ان کا تقویٰ مسلم ہو۔ اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے یہ بھی خیال رکھا ہے کہ صرف اسی حدیث کو لیں جس کی صحت پر اجماع ہو چکا ہو۔ اگر کوئی حدیث ان کے معیار کے مطابق صحیح ہے اور دوسرے محدثین کے نزدیک مشتبہ تو اسے چھوڑ دیا ہے۔ لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس احتیاط کے باوجود کچھ ایسی احادیث شامل ہو گئی ہیں جن کی صحت پر اجماع نہیں ہے۔ اجماع سے امام صاحب کی مراد اجماع امت نہیں بلکہ اس دور کے مشہور شیوخ کا اجماع ہے، ان شیوخ میں امام احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین، عثمان بن ابی شیبہ اور سعید بن منصور کے نام لے جاتے ہیں۔

انھوں نے رِوَاۃ حدیث کے تین طبقے مقرر کیے ہیں۔ پہلے طبقے میں ان محدثین کا شمار ہے جو حیثیت و ثقاہت اور علم و زہد میں اعلیٰ درجے پر ہوں۔ دوسرے طبقے میں ان لوگوں کا شمار ہے جو پہلے درجے کے راویوں سے قدرے کم ہوں اور تیسرے طبقے میں ان کا شمار ہے جن کو عام طور سے مردود اور متہم بالکذب قرار دیا گیا ہو۔ اپنی

کی خوبیوں اور خامیوں سے فائدہ اٹھانے کا پورا موقع حاصل نہ۔ امام مسلم نے نہایت تورع اور احتیاط کے ساتھ اپنی سنی نبویٰ میں لاکھ حدیثوں میں سے اپنی تصحیح کا انتخاب کیا بلکہ اپنی ذاتی تحقیق کے علاوہ مزید احتیاط کے پیش نظر اس مجموعے میں صرف ان احادیث کو شامل کیا ہے جن پر اس دور کے علماء و محدثین کا اتفاق تھا۔ کتاب کو مکمل کرنے کے بعد آپ نے اسے جرح و تعدیل اور فن حدیث کے امام حافظ ابو زرعہ کی خدمت میں پیش کیا، حافظ موصوف نے اس میں سے جن احادیث پر بحث کی نکال دیا۔ تقریباً پندرہ سال کی محنت کے بعد یہ کتاب تیار ہوئی۔ عام طور سے اس کا نام 'الجامع الصحیح' ہے لیکن بعض لوگوں نے اعتراض کیا ہے کہ اس پر جامع کا اطلاق نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ جامع اصطلاح میں حدیث کی اس کتاب کو کہیں گے جس میں تفسیری احادیث بھی خاصی تعداد میں موجود ہوں، اس کتاب میں تفسیری احادیث بہت کم ہیں۔ اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ امام مسلم تفسیر سے متعلق اکثر روایات کو کتاب کے مختلف حصوں میں بیان کر چکے تھے اس لیے کتاب التفسیر میں ان کو دوبارہ بیان نہیں کیا، دوسرے یہ کہ تفسیری روایات بہر حال موجود ہیں اس لیے اس کو جامع کی صفت سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔

امام صاحب نے اپنی اس کتاب کی ترتیب و تالیف میں غیر معمولی احتیاط سے کام لیا ہے۔ انھوں نے جس زمانے میں اپنی اس کتاب

اس کتاب میں انھوں نے یہ شرط رکھی ہے کہ وہی حدیث شامل کریں گے جس کے راوی پہلے طبقے سے تعلق رکھتے ہوں لیکن اگر ضرورت ہوئی تو دوسرے طبقے کی روایتوں کو بھی جگہ دی جائے گی۔ تیسرے طبقے کے سلسلے میں وضاحت سے ذکر ہے کہ ان کی روایات کو ہرگز داخل کتاب نہ کریں گے۔ امام مسلم اور امام بخاری دونوں کی کتب میں اپنی صحت و ثقاہت میں درجہ اول کی کبھی جاتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بہت سے ایسے راوی ہیں جن سے امام بخاری نے روایت کی ہے اور امام مسلم نے نہیں کی یا امام مسلم نے کی ہے اور امام بخاری نے ان کو معتبر قرار نہیں دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے جو شرائط ثقاہت کے لیے اپنی اپنی کتابوں میں رکھے تھے ان پر یہ لوگ پورے نہیں اتارتے۔ لیکن سو ایسے راوی ہیں جو امام مسلم کے یہاں تو موجود ہیں لیکن امام بخاری نے ان سے کوئی روایت نہیں کی ہے، اسی طرح سے ایسے بھی کئی سو ہیں جو امام بخاری کے یہاں موجود ہیں لیکن امام مسلم انھیں اپنی شرائط پر پورا نہیں پاتے اور ان سے کوئی روایت نہیں کرتے۔

صحیح مسلم کی بعض ایسی خوبیاں ہیں جو اس کو احادیث کے دوسرے مجموعوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ امام مسلم تمام حدیثوں کو ایک خاص انداز سے اور مناسب باب کے تحت درج کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ روایات کی مختلف سندوں اور الفاظ کے اختلافات کا ذکر کرتے ہیں۔ صحیح مسلم سے استفادہ آسان ہے اس لیے کہ ایک باب سے متعلق

حادثہ ایک ہی جگہ مل جاتی ہیں۔ سند حدیث میں راویوں کے نام و نسب کا بھی پورا خیال رکھتے ہیں اس لیے کہ ایک ہی نام کے دو شخص ہو سکتے ہیں۔ امام صاحب ایسی جگہوں پر ابن فلاں کھڑے اس کی وضاحت کر دیتے ہیں کہ ان کی مراد کس شخص سے ہے۔ اسی طرح سے اگر کسی راوی کی کثرت یا نسب میں فرق ہو تو اس کی بھی توضیح کر دیتے ہیں، اس سے امام صاحب کی علمیت اور واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے اور دستِ نظر و صداقت کا پتہ چلتا ہے۔ حدیث کی پختانہ بن کے ساتھ ساتھ انھوں نے "حدیثنا" اور "انہنا" کے فرق کا بھی خیال رکھا ہے۔ عام طور سے اُس زمانے میں تعلیم حدیث کے دو طریقے رائج تھے، ایک تو یہ کہ اساتذہ خود ہی حدیث پڑھتے اور اس کی تشریح اور اس سلسلے میں ضروری گفتگو کرتے جاتے ہیں اسے "حدیثنا" سے روایت کرتے ہیں۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ شاگرد پڑھتا اور استاد حدیث سے متعلق مسائل پر گفتگو کرتا، اسے "انہنا" سے روایت کرتے۔ اس طریقہ تعلیم سے حدیث کی صحت پر یا اس کے راویوں پر کوئی حرج نہیں آتا۔ خواہ شاگرد پڑھے اور استاد معانی و مفہوم بیان کرے یا استاد خود ہی پڑھے اور خود ہی تشریح کرے۔ دونوں باتیں برابر ہیں لیکن فنی اور لغوی حیثیت سے اس سلسلے میں علماء نے بحثیں کی ہیں۔ امام بخاری، امام زہری، امام یحییٰ بن سید و غیرہ کے نزدیک "انہنا" کے بجائے "حدیثنا" یا "حدیثنا" کے بجائے "انہنا" کہہ دینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن امام شافعی، امام ازہری، امام نسائی و غیرہ اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک اگر شاگرد



جائیں تو حدیثوں کی مجموعی تعداد چار ہزار باقی رہتی ہے۔  
 صحیح مسلم کے شروح و حواشی تقریباً ہر زمانے میں لکھے گئے۔  
 بڑے بڑے علماء و محدثین امام صاحب کی بیان کی ہوئی احادیث  
 کے معانی و مطالب اور مفہوم کی توضیح میں لگے رہے ان میں سے  
 چند اہم کتابیں یہ ہیں:

۱۔ المفہم فی شرح غریب مسلم: یہ امام عبدالغفار بن اسماعیل  
 تصنیف ہے۔

۲۔ شرح مسلم: یہ امام ابوالقاسم اسماعیل بن محمد اصفہانی  
 تصنیف ہے۔

۳۔ المعلم بفوائد کتاب مسلم: ابو عبد اللہ محمد بن علی المازنی  
 تصنیف ہے اس کے مصنف ہیں۔

۴۔ الاکمال فی شرح مسلم: مصنف قاضی عیاض بن  
 موسی مالکی تصنیف ہے۔

۵۔ شرح مسلم: عماد الدین عبدالرحمن بن عبدالعلی مصری  
 تصنیف ہے۔

۶۔ المفہم لما اشکل من تلخیص کتاب مسلم: ابو العباس احمد بن  
 عمر بن ابراہیم القزطی

نے استاد سے سنا ہے تو وہ حدیثا ہی کہہ سکتا ہے اگرنا نہیں۔  
 امام مسلم بھی انہی لوگوں سے متفق ہیں اور اپنی صحیح میں اس فرق کی  
 صراحت کرتے گئے ہیں۔ اگر وہ راویوں کے الفاظ میں اختلاف ہے  
 خواہ معنی ایک ہی نکلے ہوں تو وہ دونوں کے الگ الگ الفاظ  
 بیان کرتے ہیں۔ حدیثوں میں صحابہ و تابعین کے اقوال نقل نہیں  
 کرتے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس طرح سے آگے چل کر اقوال صحابہ اور  
 اقوال رسول خلط ملط ہو جائیں گے۔ علم حدیث سے چونکہ لوگوں کو  
 بہت دل چسپی تھی اس لیے کچھ ایسے مجموعے تیار ہو گئے تھے جن میں  
 احادیث صرف ایک ہی سند سے روایات کی گئی تھیں جب بڑے مجتہد  
 مرتب کیے جانے لگے تو سوال یہ اٹھا کہ اگر ایسے مجموعوں سے کئی روایتیں  
 لی جائیں تو کیا ہر حدیث کے لیے وہی سلسلہ سند بار بار پیش کیا جائے  
 یا ایک ہی مرتبہ پیش کر کے بعد کی حدیثیں اسی پر معمول کر دی جائیں  
 اس سلسلے میں بعض بزرگوں کا خیال تھا کہ ایک ہی سند بار بار بیان  
 کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ دیکھ بن جراح اور یحییٰ بن عیین اس  
 خیال کے حامی تھے دوسری طرف ابو اسحاق اسفرائینی کا خیال تھا  
 کہ یہ بات جائز نہیں ہے بلکہ ہر حدیث کو بیان کرتے وقت اس کی  
 پوری سند بھی بیان کرنی چاہیے۔ امام مسلم بھی ان کے رائے سے  
 متفق تھے۔

یہ ایسی خوبیاں ہیں جنہوں نے مسلم کو بڑی اہمیت و خصوصیت  
 عطا کی اور اسے ایک عمدہ و مستند تصنیف بنا دیا۔ اس میں منقول  
 سکرات احادیث کی تعداد بارہ ہزار ہے، اگر محکرات حذف کر دیے

(۳۵۶ھ) کی تالیف ہے، یہ صحیح مسلم کی تفسیر و ترویج ہے، اس کے ساتھ ساتھ غریب الفاظ کی تشریح، اعراب کے سلسلے میں بحثیں اور احادیث سے متعلق مسائل کا استنباط اور استدلال بیان کیا ہے۔

۷۔ المنہاج فی شرح مسلم بن حجاج : یہ شرح ابو زکریا یحییٰ بن شرف الزہری (۳۸۶ھ) کی ہے۔ یہ شرح بہت زیادہ مقبول رہی ہے۔ امام نووی فرماتے تھے کہ اگر کچھ لوگوں کی بے رغبتی اور کم ہمتی کا خیال نہ ہوتا تو میں صحیح مسلم کی شرح سو جلدوں میں کرتا۔ اس کا اختصار علامہ شمس الدین قزوینی (۷۵۰ھ) نے کیا ہے۔

۸۔ شرح مسلم : ابو الفرج عیسیٰ بن مسعود الزہراوی (۵۴۶ھ) نے اسے تصنیف کیا۔ پانچ جلدوں میں ہے اور مشہور ہے۔

۹۔ الدیباچ علی صحیح مسلم : جلال الدین السیوطی (۸۹۹ھ) کی لکھی ہوئی ہے۔

۱۰۔ منہاج الابہاج : شیخ شہاب الدین احمد بن محمد قسطلانی کی تالیف ہے، آٹھ جلدوں میں تقریباً نصف صحیح کی تشریح ہے۔

۱۱۔ شرح مسلم : ملا علی قاری (۱۰۱۴ھ) کی تالیف ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی شرحیں لکھی گئیں۔

## امام ابو داؤد

(ولادت ۲۰۴ھ - وفات ۲۴۵ھ)

ان کا نام سلیمان اور کنیت ابو داؤد ہے، والد کا نام اشعث بن اسحاق ہے، ان کی پیدائش سجستان میں ہوئی۔ اسی نسبت سے سجستانی کہے جاتے ہیں، ان کا گھر انا متول و معزز تھا، ابتدائی تعلیم کے بعد امام داؤد نے علم حدیث کی طرف توجہ کی اور اپنے دور کے مشہور اور جلیل القدر اساتذہ حدیث سے فیض اٹھایا۔ اس علم کے حصول کے لیے عراق، خراسان، مصر، شام، حجاز اور دوسرے ملکوں کے سفر کیے، ان کے اساتذہ میں احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، ابو ثور، یحییٰ بن معین، ابو بکر بن ابی شیبہ، مسلم بن ابراہیم، قتیبہ بن سعید وغیرہ شامل ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ بغداد میں گزارا اور وہیں اپنی سنن کی تالیف کی۔ جس طرح سے ان کے اساتذہ کی فہرست طویل ہے ویسے ہی ان کے شاگرد بھی بے شمار

یہ کچھ صرف آپ کی صحبت کے لیے اور کچھ آپ کی عقیدت مندی میں۔  
معاشرین علماء بھی علمی مسائل پر آپ سے گفتگو کرنے کے لیے آتے  
تھے، ابو محمد احمد بن محمد بن لیث نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ مشہور عارف  
باللہ حضرت سہیل بن عبد اللہ تری ان سے ملنے آئے، امام صاحب  
بہت خوش ہوئے اور ان کا استقبال کیا، حضرت سہیل نے ان  
سے کہا کہ امام صاحب اپنی زبان دکھائیے جس سے آپ حدیث رسول  
بیان کرتے ہیں تاکہ میں اس کو بوسہ دوں۔ امام صاحب نے اپنی  
زبان باہر نکالی تو انھوں نے بڑی عقیدت سے اسے بوسہ دیا۔

امام صاحب کو بے شمار احادیث یاد تھیں، حدیث کی ہر جرح و  
تعدیل میں بھی ان کو مہارت تھی، لوگوں نے لکھا ہے کہ وہ نہ صرف  
احادیث نبوی کے حافظ و امین تھے بلکہ متون و اسناد پر بھی ان کی  
اچھی نظر تھی۔ امام صاحب کا دور علم حدیث کا روشن دور تھا، بڑے  
بڑے محدثین اور ائمہ فہم موجود تھے، امام صاحب نے سب سے اپنی  
استاذی حیثیت اور جلالت کو تسلیم کر لیا۔ اس دور کے بہت سے  
بزرگوں نے ان کو امام المحدثین کہا ہے۔ امام نووی نے لکھا ہے کہ علماء  
اسلام ابوداؤد کی مدح و توصیف ان کے ذوق علم حدیث میں ہم صاحب  
اور ذہن رسا متفق ہیں۔ محمد بن غزالی نے لکھا ہے کہ ان کے معاصرین  
اور اہل زمانہ ان کی امامت فہم کے معترف تھے۔

تھے، جن میں ابو عمرو، ابوسعید، ابوبکر محمد بن عبد الرزاق، ابوالحسن علی بن  
حسن، ابویسٰی اسحاق، ابوعبید محمد بن علی، امام ترمذی، امام نسائی  
وغیرہ ہیں۔

امام صاحب بڑے اچھے حافظ کے مالک تھے، بڑے متقی اور  
پرہیزگار تھے، عبادت و ریاضت میں لگے رہتے تھے۔ شریعت کی  
پابندی اور سنت نبوی کا خاص طور سے خیال رکھتے تھے۔ مزاج میں  
سادگی اور نرمی تھی۔ اپنے گزرتے کی ایک آستین بہت کشادہ اور دوسری  
تنگ رکھتے تھے، کسی نے اس کا سبب دریافت کیا تو بولے ایک  
آستین کشادہ اس لیے رکھتا ہوں کہ اپنی کتاب کے اجزاء اس میں  
رکھ سکوں اور دوسری بلا ضرورت کشادہ رکھتا ہوں کہ اگر کسی نے  
مزاج اور انداز اپنے استاد امام احمد بن حنبل سے بہت ملتا تھا۔ اس  
دور کے علماء و مشائخ بھی ان کے علم و فضل کا اعتراف کرتے تھے۔  
کچھ لوگ کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا میں حدیث کے لیے اور  
آخرت میں جنت کے لیے پیدا کیا ہے۔ محمد بن اسحاق اور ابوالہجیم  
حربلی کہتے تھے کہ بہت سے لوگوں نے ان کو امام عصر قرار دیا ہے۔  
ابو حاتم نے لکھا ہے کہ ابوداؤد علم حدیث، علم فقہ اور تقویٰ و خداؤفی  
میں دنیا والوں کے امام تھے، علامہ ذہبی نے ان کو عالم باعمل کہا ہے۔  
امام صاحب کے پاس ہر قسم کے لوگ آتے تھے، کچھ طلب علم کے

کے باوجود ان کی تصانیف کی تعداد خاصی تھی جن میں کتاب السنن، کتاب المراسیل، کتاب النسخ والنسوخ، کتاب المسائل، کتاب الرد علی اہل القدر، کتاب فضائل الانصار، اخبار النوار، کتاب التفسیر، کتاب نظم القرآن، کتاب فضائل القرآن، کتاب الدعاء، کتاب البعث، والعشر وغیرہ ہیں۔

ان سب میں ان کی سنن سب سے مشہور ہے اور فن حدیث میں اہم اور مستند بھی جاتی ہے۔ ٹھیک طور سے تو پتا نہیں چلتا کہ یہ کس سنہ میں مرتب ہوئی لیکن اندازہ ہے کہ ۲۸۱ھ سے پہلے مرتب ہوگئی تھی، اس لیے کہ امام ابو داؤد نے اسے مرتب کرنے امام احمد بن حنبل کے سامنے پیش کیا تھا اور انھوں نے اس کی تعریف کی تھی۔ امام حنبل کا انتقال ۲۴۱ھ میں ہوا۔ انھوں نے اپنی سنن کی چار ہزار آٹھ سو احادیث کا انتخاب پانچ لاکھ حدیثوں سے کیا۔ ان کی سنن کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں صرف سنن احکام کی روایات ہیں۔ اس سے پہلے ایسی کتابیں مرتب کرنے کا رواج نہ تھا، اس خصوصیت کی بنا پر بہت جلد اس کی اہمیت ہوگئی، اور علمائے امت نے اسے بہت مفید اور ضروری کتاب قرار دیا۔ عام طور سے صحیح حدیث ہی کا انتخاب کیا ہے، کمزور حدیثوں کو اگر اتفاق سے کسی خاص مسئلے میں لیا ہے تو ان کے ضعف یا غلطی کو بیان کر دیتے ہیں۔ اگر کوئی روایت دو طریقوں سے مروی ہے تو دونوں

عام طور سے ان کی شہرت محدث کی حیثیت سے زیادہ ہے لیکن فقہ میں بھی ان کو کمال حاصل تھا، اور یہ غالباً ان کے فقیہی ذوق ہی کی بنا پر تھا کہ انھوں نے اپنی کتاب میں احکام و مسائل سے متعلق احادیث جمع کی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ تفسیر کے علم سے بھی واقف تھے، تفسیر فقہ اور حدیث کے علاوہ مردہ علوم سے بھی ان کو خاصی واقفیت تھی۔ امام صاحب کو دنیا اور اس کے لوازمات سے دل چسپی نہ تھی۔ دربار داری اور علماء کی مجلسوں سے بہت بچتے تھے۔ تقریباً تمام مذکورہ نگاروں نے یہ واقعہ لکھا ہے کہ ایک روز امیر ابو احمد موثق ان کے گھر آئے۔ امام صاحب نے پوچھا کیسے رحمت فرمائی تو انھوں نے بزباب و پاک آپ کے پاس تین درخواستیں لے کر آیا ہوں۔ پہلی تو یہ کہ آپ بصرہ تشریف لے چلیں اور وہیں مستقل قیام کریں، کہ زیادہ سے زیادہ لوگ آپ سے فیض اٹھا سکیں، دوسری یہ کہ میرے بچوں کو سنن کی تعلیم دیں، تیسری یہ کہ میرے بچوں کو باقی طلبہ سے الگ وقت دیں۔ امام صاحب نے فرمایا کہ پہلی دو چیزیں باتیں مناسب ہیں لیکن تیسری بات ممکن نہیں ہے اس لیے کہ حصول علم میں عام طلبہ اور خلیفہ کی اولاد سب برابر ہیں، ان میں تفریق ممکن نہیں۔ چنانچہ جب امام صاحب نے بصرہ میں درس کی مجلس قائم کی تو خلیفہ کے لڑکے بھی اس میں شریک ہوئے۔ امام صاحب نے اپنی زندگی کے آخری چند سال بصرہ میں گزارے اور وہیں ۲۸۵ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔

امام صاحب کی زندگی کا بیشتر حصہ طلب علم کے لیے سفر میں گزرا اور اس سے جو بچا وہ درس و تدریس میں صرف ہوا لیکن اس

کا ذکر کر دیتے ہیں۔ طویل حدیثوں کو مختصر کرتے ہیں تاکہ اس کے مفہوم کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ کبھی کبھی ایک حدیث مختلف سندوں کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ اگر کسی حدیث میں مرفوع یا موقوف کا اختلاف ہو تو اس کا ذکر کرتے ہیں، ایسے راویوں سے کوئی حدیث نہیں لیتے جو موقوف ہیں، کبھی کبھی راویوں کے نام کے ساتھ ان کے القاب یا کنیت کو بھی بیان کرتے ہیں۔ عام طور سے تکرار سے احتراز کیا ہے اگر کسی حدیث کی تکرار کی ہے تو اس کے متن یا سند میں کسی کمی یا زیادتی کے پیش نظر کی ہے۔

سنن ابی داؤد کا شمار صحاح ستہ میں ہوتا ہے، بہت سے علماء نے اس کو بخاری و مسلم کے بعد کا درجہ دیا ہے اور کہا ہے کہ قرآن مجید اسلام کی اصل اور بنیاد ہے اور سنن ابی داؤد اس کا ستون۔ ابن الاعرابی کا خیال ہے کہ کتاب اللہ اور سنن ابی داؤد کے بعد کسی اور چیز سے واقفیت کی ضرورت نہیں۔ امام خطابی کہتے ہیں کہ سنن ابی داؤد عمدہ اور نفیس کتاب ہے، علوم دینی میں ایسی بے نظیر کتاب نہیں لکھی گئی۔ تمام لوگوں میں اسے حسن قبول حاصل ہوا اور وہ اہل علم اور فقہاء کے مختلف طبقات میں فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے اس میں ہر ایک کی آسودگی کا سامان موجود ہے۔ اکثر ملکوں کے لوگوں کا اس پر اعتماد اور دار و مدار ہے یہ امام صاحب نے خود اپنی سنن کے متعلق لکھا ہے۔

سنن میں چار ہزار آٹھ سو احادیث ہیں جو سب صحیح صحیح کے قریب ہیں، میں نے اپنے علم و تحقیق کے بعد صحیح روایتیں نقل کرنے کی کوشش کی ہے اور جو حدیثیں سند کے اعتبار سے اعلا درجے کی ہیں ان کو ترجیح دی ہے۔ مرسل حدیثیں اس وقت نقل کرتا ہوں جب مسند اور متصل روایتیں نہیں ملتیں۔ کیوں کہ ایسی احادیث اہم ائمہ کے نزدیک لایق حجت رہی ہیں۔ مگر اور ضعیف سند والی روایتوں کا قابل اعتناء نہیں سمجھتا البتہ صحیح روایات نہ ملنے کی شکل میں ان کی خامیوں کا ذکر کرتے ہوئے ان کو نقل کر دیا ہے۔

امام صاحب نے لکھا ہے کہ میرے اس مجموعے میں چار احادیث ایسی ہیں جو دین پر عمل کرنے کے لیے کافی ہیں:

- ۱۔ انما الاعمال بالنیات
  - ۲۔ من حسن اسلام المرء ترکہ مالا یعنیه
  - ۳۔ لا یؤمن احدکم حتی یحب لایحیہ ما یحب لنفسه
- اعمال کا دار و مدار نیت پر ہے۔ کسی شخص کے اپنے مسلمان ہونے کی علامت یہ ہے کہ وہ بے فائدہ کاموں کو چھوڑ دے۔ کوئی شخص اس وقت تک مکمل طور پر مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی پسند نہ

نے فرمایا جو شخص سنن کا علم حاصل کرنا چاہتا ہو اسے سنن ابی داؤد پڑھنا چاہیے۔ امام غزالی کا خیال ہے کہ علم حدیث میں بھی ایک کتاب مجتہد کے لیے کافی ہے۔ امام نووی نے لکھا ہے کہ جو شخص فقہ میں دل چسپی رکھتا ہو اس کو سنن ابی داؤد کا مطالعہ اچھی طرح سے کرنا چاہیے نیز مکرنام غزوری مسائل جن احادیث سے ثابت ہوتے ہیں وہ سب نہ صرف اس میں جمع کر دی گئی ہیں بلکہ ان کی تفسیر و تہذیب اس طرح سے کی گئی ہے کہ ان سے احکام کو سمجھنا آسان ہو گیا ہے۔

سنن ابی داؤد کو ان کے متعدد شاگردوں نے امام صاحب سے روایت کیا ہے، لیکن ان میں سے چار زیادہ مشہور ہیں:

۱۔ ابوعلی محمد بن احمد بن عمرو دؤلوی (رحمۃ اللہ علیہ) انھوں نے سنن کو امام صاحب سے مشہور میں سماع کیا تھا، امام صاحب نے آخری بار اس کا املا اسی سنہ میں کرا لیا تھا۔ پھر اسی سال ان کا انتقال ہو گیا۔ اس طرح سے یہ نسخہ آخری کچھا جاتا ہے اور اسی لیے زیادہ معتبر اور مستند ہے۔

۲۔ ابو بکر محمد بن عبدالرزاق واسم (رحمۃ اللہ علیہ) ان کا نسخہ دؤلوی کے نسخے سے بڑی حد تک ملتا ہے، البتہ کہیں کہیں کچھ احادیث آگے پیچھے ہو گئی ہیں۔ حدیثوں کی تعداد دونوں میں برابر ہے بعض علماء اسی نسخے کو زیادہ قابل اعتبار سمجھتے ہیں۔

۳۔ حافظ ابو یوسفی الطحی بن یوسف بن سعید دلی (رحمۃ اللہ علیہ) ان کا نسخہ

کرمہ جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

۴۔ الحلال بین والحرام بین  
دینیہ و مادیہ مشتبہات فن  
اتقی الشبہات استبرأ  
لدینہ

حلال اور حرام دونوں کا ہر ہیں اور  
ان کے درمیان کچھ مشتبہات ہیں پس  
جو شخص مشتبہات سے بچنا چاہے، اس  
نے اپنے دین کو محفوظ کر لیا۔

شاہ عبدالعزیز امام صاحب کے قول کی تشریح یوں کرتے ہیں:

"ان کے کافی ہو۔" سے یہ مراد ہے کہ شریعت کے قواعد کلیہ مشہورہ معلوم کرنے کے بعد جزئیات مسائل میں کسی مجتہد یا مرشد کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ مثلاً عبادات کی درستگی کے لیے پہلی حدیث، عمر عزیز کے اوقات کی حفاظت کے لیے دوسری حدیث، حقوق ہمسایہ و مملوک اقارب و اہل تعارف و معاصی کی رعایت کے لیے تیسری حدیث، اور ان شکوک کے ازالے کے لیے چار اختلاف علماء یا دلائل کے منتخب ہونے سے پیش آتے ہیں چوتھی حدیث کافی ہے۔ گویا ہر دعاقل کے لیے یہ چار حدیثیں استاد و پیر کا درجہ رکھتی ہیں۔"

امام صاحب کی یہ کتاب خاص و عام میں مقبول رہی اور ہر ملک کے لوگوں نے اسے درس میں شامل رکھا۔ حسن بن محمد بن ابراہیم کہتے ہیں کہ انھوں نے ایک خواب میں رسول اکرم کی زیارت کی۔ آپ

تھے مگر پورا ذکر کے۔ مجدد ہوسک کی مخرج سات جلدوں میں ہے، اگر مکمل ہوئی تو اندازہ ہے کہ چالیس جلدیں ہوتیں۔

۴۔ شرح سنن ابی داؤد : اس کے مصنف بدرالدین عینی (۷۵۵ھ) ہیں۔

۵۔ مرقاة المصعود : یہ حافظ جلال الدین سیوطی (۹۱۱ھ) کی شرح ہے۔

۶۔ شرح نووی : اس کے مصنف ابو زکریا عی الدین بن شرف نووی (۶۷۶ھ) ہیں۔ یہ بڑے اچھے شارح اور مشہور محدث تھے۔ انھوں نے صحیح مسلم کی بھی شرح کی ہے۔

۷۔ شرح ابن ارسلان : اس کے مصنف ابوالعباس احمد بن حسین املی مقدسی (۸۴۴ھ) ہیں۔ ابن ارسلان کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ انھوں نے ابوداؤد کی مفصل اور جامع شرح کی۔

۸۔ شرح ابن قیم : شمس الدین محمد بن ابوبکر قیم جزیری (۷۵۱ھ) کی اس شرح کو اچھا تسلیم کیا گیا ہے۔ بعض احادیث پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

۹۔ غایۃ المقصود : اس کے مصنف مولانا شمس الحق عظیم آبادی ہیں۔ ۳۲ جلدوں میں ہے جس میں سے غالباً دو ہی ایک جلد میں شامل ہو سکتے ہیں۔ یہ بہت ہی مفصل شرح ہے اور جن علماء نے اسے دیکھا ہے اس کی تعریف کی ہے۔ اس کا خلاصہ عون المعبود کے نام سے خود انھوں نے مختلف علماء کی مدد سے کیا ہے۔

ابن داور کے نسخے سے ملتا ہے۔

۴۔ حافظ ابوسعید احمد بن محمد بن زیاد معروف بہ ابن عرابی (۳۸۰ھ) ان کا نسخہ دوسرے نسخوں سے کافی مختلف ہے، بہت سی حدیث مختلف ابواب میں کم ہیں اور بعض ابواب ہی درج نہیں ہیں مثلاً کتاب الفتن والملاحم، کتاب الحروف، کتاب النبی تم وغیرہ سرے سے موجود نہیں ہیں۔ کتاب اللباس، کتاب الوضوء، کتاب الصلوۃ وغیرہ میں بہت سی حدیثیں کم ہیں۔

سنن ابی داؤد کی افادیت اور اہمیت کے پیش نظر ہر زمانے کے علماء و محدثین نے اس کی شرحیں لکھیں، حاشی مرتب کیے اور اختصار بھی کیے۔ ان میں سے چند کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔

۱۔ معالم السنن : اس کے مصنف ابوسلمان احمد بن محمد بن ابراہیم خطابی (۷۸۸ھ) ہیں۔ یہ سب سے قدیم، ممتاز اور مشہور شرح ہے۔ چونکہ یہ بہت مبسوط بھی اس لیے حافظ شہاب الدین ابوجمعد احمد بن عمر مقدسی (۷۶۵ھ) نے اس کا خلاصہ لکھا اور اس کا نام مجالۃ العالم من کتاب المعالم رکھا۔

۲۔ شرح سنن ابی داؤد : اس کے مصنف قطب الدین ابوبکر بن احمد الشافعی (۷۵۲ھ) ہیں۔ یہ شرح چار ضخیم جلدوں میں ہے۔

۳۔ شرح سنن ابی داؤد : اس کے مصنف ابوزید احمد بن عبدالرحیم عراقی (۸۲۶ھ) ہیں۔ بہت تفصیل سے اسے مکمل کرنا چاہتے

۱۰۔ بذل الجہود: مولانا خلیل احمد سہارن پوری کی تصنیف ہے۔ پہلے ہندستان میں چھپی تھی۔ اب مصر سے بیس جلدوں میں شائع ہو گئی ہے۔

ان کے علاوہ بھی بہت سے لوگوں نے اس سے متعلق کتابیں لکھی ہیں۔ اور اس کی اہمیت و افادیت کو بڑھایا ہے۔

## امام ترمذی

(ولادت ۲۰۹ھ - وفات ۲۷۹ھ)

امام ترمذی کا نام محمد اور کنیت ابو عیسیٰ ہے۔ ۲۰۹ھ میں بخ کے شہر ترمذ میں پیدا ہوئے۔ اسی لیے ترمذی مشہور ہوئے۔ نام طور سے خود انہوں نے اپنے نام کے بجائے اپنی کنیت ابو عیسیٰ کو زیادہ استعمال کیا ہے۔ اپنی جگہ میں جہاں بھی اپنا ذکر کیا ہے قال ابو عیسیٰ لکھا ہے۔ امام ترمذی نے کہاں اور کن لوگوں سے ابتدائی تعلیم حاصل کی اس کی تفصیل نہیں ملتی لیکن اس زمانے میں خراسان اور ماوراءالنہر کا علاقہ اپنے علماء و مشائخ کی وجہ سے بڑی شہرت رکھتا تھا۔ مورخین کا خیال ہے کہ یہ بھی اپنی علمی نشنگی دور کرنے کے لیے ان علاقوں میں رہے اور عراق و حجاز وغیرہ کا بھی سفر کیا۔ علم حدیث سے لگاؤ تھا۔ اس لیے شروع ہی سے اس طرف توجہ دی اور اس دور کے اہم علماء و محدثین سے فیض اٹھایا۔ ان کے



کمال پر بڑے بڑے علماء و محدثین کا اتفاق ہے۔ علامہ ذہبی اور ابن حجر عسقلانی نے ان کا شمار ائمہ محدثین میں کیا ہے اور ان کو امام بخاری کا جانشین قرار دیا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ امام بخاری کے بعد خراسان میں کوئی شخص بھی علم و ورع میں ایسی جیسا نہ تھا۔ امام ترمذی کا حافظہ غیر معمولی تھا، ایک مرتبہ سن کر عام طور سے ان کو حدیث یاد ہو جاتی تھی۔ اس سلسلے میں ایک دل چسپ واقعہ بہت سے تذکرہ نگاروں نے نقل کیا ہے جسے امام ترمذی خود یوں بیان کرتے ہیں کہ ایک شیخ سے میں نے ان کی احادیث کے دو جزو فتل کیے لیکن انھیں سننا نہ سکا تھا، اتفاق سے ایک بار مکر جاتے ہوئے ان شیخ سے ملاقات ہو گئی، میں نے شیخ سے درخواست کی کہ آپ ان حدیثوں کو پڑھیں، مگر میں اپنی نقل کی ہوئی حدیثوں سے ان کا موازنہ کر لوں۔ شیخ راضی ہو گئے۔ امام ترمذی کہتے ہیں کہ میں نے ان اجزاء کو اپنے سامان میں بہت تلاش کیا مگر وہ نہ مل سکے۔ چونکہ وہ حدیثیں مجھے یاد تھیں اور فتن احتیاط کی خاطر میں دوبارہ شیخ سے سن کر مقابلہ کرنا چاہتا تھا اس لیے میں نے کچھ سادہ کاغذ اپنے ہاتھ میں لے لیے اور شیخ سے قرأت کی درخواست کی، شیخ پڑھتے جاتے تھے اور میں اپنے ذہن میں ان احادیث کو محفوظ کرتا جاتا تھا۔ اتفاق سے شیخ کی نظر سادہ کاغذ پر پڑ گئی وہ بہت خفا ہوئے اور غصے سے فرمایا کہ مجھ سے مذاق کرتے ہوئے تم کو شرم نہیں آتی۔ امام صاحب کہتے ہیں کہ میں نے کچھ ہوئے اجزاء کے نہ ملنے کی وجہ سے مجبوراً ایسا کرنے کا تقہر سنا کہ حدیث کی اور کہا کہ آپ سے نقل کیے ہوئے اجزاء میرے ذہن میں پوری

اساتذہ میں ابراہیم بن عبد اللہ ہروزی، اسماعیل بن موسیٰ اسدی، علی بن حجر، قیس بن سعید، امام بخاری، امام مسلم اور امام ابو داؤد کے نام شامل ہیں۔ امام بخاری سے بالخصوص انھوں نے بہت استفادہ کیا تھا، امام بخاری بھی ان کی علمیت و فضیلت کی وجہ سے ان کو بہت مانتے تھے۔ امام ترمذی کے شاگردوں کی تعداد بھی خاصی ہے۔ ان میں ہشام بن کلیب، شاشی، احمد بن یوسف نسفی، محمد بن محبوب المروزی، داؤد بن نصر، محمد بن منذر ابن سعید ہروزی وغیرہ ہیں۔ امام ترمذی سے ان کے استاد امام بخاری نے بھی دو حدیثیں روایت کی ہیں اور اسی بنا پر لوگوں نے امام بخاری کو ان کے اساتذہ اور شاگرد دونوں فہرستوں میں شمار کیا ہے۔

امام ترمذی بڑے عابد و زاہد اور متقی تھے، اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان کو غیر معمولی قوت حافظہ سے نوازا تھا۔ اکثر عبادت و ریاضت میں لگے رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے خوف اور نرم دلی کی وجہ سے اکثر گریہ و زاری طاری رہتا تھا اور اسی میں آخر عمر میں ان کی بینائی ختم ہو گئی تھی۔ امام بخاری اگرچہ ان کے استاد تھے لیکن ان سے اتنا متاثر تھے کہ ان سے کہتے تھے کہ میں نے تم سے جتنا استفادہ کیا ہے تم نے مجھ سے اتنا نہیں کیا۔ امام ترمذی کے شوق تلاش و جستجو نے ان کو اس دور کا امام بنا دیا تھا۔ ان کے علم و

امام ترمذی غیر مقلد اور مجتہد تھے، بعض لوگوں نے انھیں شافعی یا حنبلی لکھا ہے لیکن یہ زیادہ صحیح نہیں ہے۔ اس شعبے کی وجہ عام طور پر یہ سمجھی جاتی ہے کہ انھوں نے بعض مسائل میں ان ائمہ کے خیالات کی تائید کی ہے، لیکن یہ بہت کمزوری دلیل ہے اس لیے کہ جب بھی کوئی شخص اپنے اجتہاد و تحقیق کے بعد رائے دے گا تو وہ کبھی کسی کے مطابق ہوگی اور کبھی کسی کے مخالف۔ اب اگر اس کی رائے کسی کی تائید کر دے تو اسے مقلد کہنا کچھ غیر مناسب سی بات ہے۔ دوسرے یہ کہ انھی لوگوں کی مخالفت بھی امام ترمذی نے بعض مسائل میں کی ہے۔

ترمذی کی نسبت سے دو اور لوگوں کی شہرت ہے اور کبھی کبھی لوگ اس نسبت کی وجہ سے دھوکا کھا جاتے ہیں، ان میں سے ایک کا نام ابو الحسن احمد ترمذی (۲۳۰ھ) ہے، یہ ترمذی کبیر کے لقب سے مشہور ہیں، احمد بن حنبل کے شاگردوں میں سے تھے، بڑے پائے کے محدث تھے، امام بخاری، امام ترمذی اور ابن ماجہ وغیرہ ان کے شاگرد تھے۔ دوسرے کا نام ابو عبد اللہ محمد بن علی بن حسن بن حکیم الترمذی (۳۵۵ھ) ہے ان کی کتاب نوادر الاصول فی موزع اخبار الرسول بہت مشہور ہے، عام طور سے علماء نے اسے غیر معتبر قرار دیا ہے، یہ نبوت پر دلالت کی فضیلت کے قائل تھے، ان کے اس عقیدے کی وجہ سے

طرح محفوظ ہیں۔ اس پر شیخ نے ان کو سنانے کا حکم دیا تو میں نے وہ تمام احادیث سنا دیں۔ شیخ کو بہت تعجب ہوا اور یقین نہ آیا کہ ایک بار ہی سن کر یہ سب حدیثیں کیوں کر یاد ہو گئیں۔ امام صاحب نے ان کے اس تعجب کو دور کرنے کے لیے ان سے کہا کہ آپ میرا امتحان لے لیجیے۔ شیخ نے چالیس ایسی احادیث پڑھیں جو صرف ان سے روایت کی جاتی تھیں۔ امام ترمذی نے ان احادیث کو بھی اسی صحت و ترتیب کے ساتھ سنا دیا۔ شیخ ان کے ذہن اور اچھی یادداشت سے بہت خوش اور متاثر ہوئے۔ ایسے اور بھی بہت سے واقعات بیان کیے جاتے ہیں۔

امام صاحب نے جس دور میں عقل و خرد کی آنکھیں کھولی تھیں اُس وقت ہر طرت حدیث کا ذوق و شوق عام تھا، قدرتی طور پر ان کی بھی توجہ اسی فن کی طرف ہوئی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کو علم تفسیر سے بھی فطری نگاہ تھی۔ فقہ سے بھی ان کو خاص دل چسپی تھی۔ علم تفسیر میں ان کی بھج بھج کا اندازہ ان احادیث اور آثار سے ہوتا ہے جو انھوں نے ابواب تفسیر میں تفراتی آیات کے سلسلے میں جمع کی ہیں۔ ان کے فقہی ذہن اور استنباط مسائل کے سلسلے میں لوگ ان کی جستجو کو شہوت کے طور پر پیش کرتے ہیں جسے صرف احادیث ہی کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک فقہی کتاب بھی کہا جاتا ہے، جس میں مختلف ائمہ کے مذاہب و دلائل پر بھی بحث کی گئی ہے۔

نے بہت پسند کیا، پھر علمائے عراق کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے بھی وادعین دی، پھر علمائے خراسان کو دکھایا تو انھوں نے بھی اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ جب تمام علماء اس سے شفق ہو گئے تو اسے عام طرح سے لوگوں کے سامنے پیش کیا۔

امام صاحب کی جامع حدیث کے نزدیک متفقہ طور پر صحاح ستہ میں شمار ہوتی ہے۔ البتہ مختلف لوگوں نے صحاح ستہ میں اسے تیسرے چوتھے یا پانچویں نمبر پر رکھا ہے، عام طور پر اس کی خدیجیوں میں حسن ترتیب افادیت اور جامعیت کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ امام صاحب نے خود اس کی تعریف کی ہے کہ جس کے گھر میں یہ کتاب ہو وہ یوں سمجھے کہ اس کے گھر میں نبی کلام کر رہا ہے، حافظ ابن اثیر جامع الاصول میں لکھتے ہیں کہ جامع ترمذی کتب صحاح میں سب سے زیادہ احسن ہے کیوں کہ اس کی افادیت اور ترتیب سب سے عمدہ ہے نیز اس میں تکرار بہت کم ہے، مذاہب اللہ اور درجہ استدلال کے ذکر اور انواع حدیث اور احوال رواد کے بیان میں یہ کتاب منفرد ہے۔ شیخ ابو اسماعیل ہر دی نے لکھا ہے کہ اس کتاب سے فقہاء علماء اور محدثین یکساں فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

حدیث صحیح کو قبول عام کا درجہ حاصل ہوتا ہے، حدیث کے صحیح ہونے کی بنیاد رواد اور سلسلہ سند پر ہوتی ہے۔ اصول حدیث میں اصحاب صحاح کم و بیش مندرجہ ذیل شرائط پر متفق ہیں:

ان کو ترمذ سے کمال دیگا تھا۔ زادرا الاصول کی اکثر حدیثوں کی نسبت ابو عیسیٰ ترمذی کی طرف لوگ غلطی سے کر دیتے ہیں اس لیے ان کے ناموں کے فرق کو سمجھنا ضروری ہے، تاکہ غلطی سے محفوظ رہا جاسکے۔ آپ نے ستر سال کی عمر پائی، مشہور ہیں ترمذ میں آپ کا انتقال ہوا اور وہیں دفن ہوئے۔ اس دور کے رواج کے مطابق امام صاحب زیادہ وقت درس و تدریس اور عبادت و ریاضت میں صرف کرتے تھے لیکن اس کے باوجود مورخین کے بیان کے مطابق انھوں نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ جامع ترمذی، کتاب اللعل، کتاب التاریخ، کتاب الزہد، کتاب الاسماء، دالخی کتاب شامل النبویہ وغیرہ مشہور ہیں۔

امام صاحب کی جامع کو لوگوں نے بہت پسند کیا، اس سے پہلے دوسرے بہت سے مجموعے تیار ہو چکے تھے، اس لیے جب امام صاحب نے اس کی تصنیف کی تو انھوں نے اپنی راہ الگ نکالی اور اس بات کی کوشش کی کہ ان کی کتاب میں کچھ ایسی خاص باتیں پیدا ہو جائیں جو دوسری کتابوں میں نہیں تھیں۔ ان کی کوشش کامیاب ہوئی اور ان کی کتاب میں بعض ایسی چیزیں لوگوں کو نظر آئیں جو ان سے پہلے غلط تھیں اور ان کی کتاب کو امتیازی حیثیت حاصل ہوئی۔ امام صاحب فرماتے ہیں کہ جب میں اس کی تصنیف سے فارغ ہوا تو اسے پہلے علمائے حجاز کی خدمت میں پیش کیا، انھوں

دیتے ہیں۔

- ۳۔ صحت ان احادیث کو دیا ہے جو کسی نہ کسی امام کا مذہب ہوں۔
- ۴۔ روایات کی تحوار بہت کم ہے، اگر ایک حدیث کو صحابہ یوں سے مروی ہے تو اسے کسی ایک صحابی سے روایت کرتے ہیں اور اس کے بعد کہتے ہیں کہ اس سلسلے میں غلال غلال دوسرے لوگوں سے بھی یہ حدیث مروی ہے، اسی کے ساتھ ساتھ اپنی روایت کی وجہ ترجیح بھی بیان کرتے ہیں۔ اس انداز بیان کی وجہ سے پڑھنے والے کو کوئی فائدہ ہوتا ہے، اول تو یہ کہ غیر مشہور روایات علم میں آجاتی ہیں، دوسرے یہ کہ اگر کسی روایت میں کوئی علت یا خامی ہے تو اس کا بھی پتا چل جاتا ہے۔ تیسرے یہ کہ اگر متن حدیث میں کوئی کمی یا زیادتی ہوتی ہے تو وہ بھی لکھ دیتے ہیں۔
- ۵۔ سند بیان کرنے کے بعد وہ حدیث کس قسم کی ہے اس کا ذکر کرتے ہیں یعنی صحیح حسن ضعیف وغیرہ۔
- ۶۔ اگر کسی حدیث کی سند یا متن میں شبہ ہے تو اسے الگ بیان کرتے ہیں۔
- ۷۔ بہت سے راوی اپنی کثرت یا کسی نسبت سے مشہور ہوتے ہیں انھوں نے ایسے لوگوں کے ناموں اور کنیتوں کا خاص طور سے ذکر کیا ہے، اس کے ساتھ ساتھ اگر کسی راوی کے نام میں اختلاف ہے تو اس کی بھی توضیح کر دیتے ہیں۔
- ۸۔ اپنی کتاب میں عنوان قائم کرتے وقت اکثر عنوان کے ساتھ اس

- (۱) راوی کا مسلمان ہونا۔ (۲) عقل سمجھ کا درست ہونا۔
- (۳) سچا ہونا (۴) عدالت مع جملہ شرائط (۵) حفظ۔
- (۶) ضبط (۷) عدم دہم (۸) سلامت ذہن وغیرہ۔

ان اوصاف میں قدرتی طور پر کمی زیادتی کا امکان ہے۔ یعنی کسی کے یہاں عدالت ہوگی، کسی کے یہاں عقل ہوگی، کسی کے یہاں صداقت وغیرہ میں کمی یا زیادتی ہو سکتی ہے۔ اس کی بنیاد پر راویوں کے درجے قائم کیے جاتے ہیں اور پھر ان مراتب کو مدنظر رکھتے ہوئے حدیث کی حیثیت متین کی جاتی ہے اور اگر کسی صحیح حدیث کی شرائط میں مختلف ہیں، امام بخاری ایک حدیث کو ہر اعتبار سے درست مانتے ہیں لیکن امام مسلم اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ امام ترمذی نے بھی اپنے اصول و ضوابط کے تحت حدیثوں کو منتخب کیا ہے۔ وہ کبھی کبھی کسی کمزور حدیث کو بھی قبول کر لیتے ہیں لیکن اسے کسی صحیح حدیث کی تائید میں استعمال کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ اس کی خامیوں اور خوبیوں کا بھی ذکر کر دیتے ہیں تاکہ پڑھنے والا حدیث کے درجے کو سمجھ سکے۔ یہ خصوصیت عام طور سے دوسری کتابوں میں نہیں ملتی ہے۔ ذیل میں ان چند خصوصیات کا ذکر ہے جو جامع ترمذی کو دوسری کتابوں سے ممتاز کرتی ہے:

- ۱۔ حدیث بیان کرنے کے بعد ائمہ مذاہب کے اقوال اور ان کے اختلافات کا ذکر کرتے ہیں تاکہ مسئلے کے متعلق دوسروں کی رائے کا پتا چل جائے۔

- ۲۔ ہر حدیث میں راوی کی حیثیت یعنی ضعیف یا قوی اور حدیث کے بارے میں کہ وہ صحیح، حسن، غریب، ضعیف وغیرہ لکھ

شاہ ولی اللہ نے لکھا ہے کہ امام ترمذی نے امام بخاری اور امام مسلم کے بیان کیے ہوئے متون و اسناد کے ابہام کی توضیح کر دی ہے اور ابو داؤد کے طریقے پر فقہی احادیث کو جمع کر کے صحابہ تابعین اور ائمہ کے مذاہب کو بھی بیان کر دیا ہے اسی کے ساتھ ساتھ احادیث کے مختلف سلسلوں کا بھی ذکر کیا ہے اور حدیث کی حیثیت کا یقین کیا ہے اور راویوں کے ناموں اور کینت وغیرہ کو بتا کر ان کے اختلافات کو دور کیا ہے۔

شاہ عبد العزیز لکھتے ہیں کہ بخاری حدیثی فوائد کے لحاظ سے اس کتاب کو تمام کتابوں پر فوقیت دی گئی ہے۔ اول اس وجہ سے کہ اس کی ترتیب عمدہ ہے اور تکرار نہیں ہے۔ دوم اس وجہ سے کہ اس میں فقہاء کا مذہب اور اس کے ساتھ ساتھ ہر ایک کا استدلال بیان کیا گیا ہے۔ سوم اس وجہ سے کہ اس میں حدیث کے انواع مثلاً صحیح، حسن، ضعیف، غریب، معلل وغیرہ کو بیان کر دیا گیا ہے۔ چہارم اس وجہ سے کہ اس میں راویوں کے نام ان کے اقباب اور کمینت کے علاوہ ان فوائد کو بھی بیان کیا گیا ہے جن کا علم الرجال سے تعلق ہے۔

امام صاحب خود بڑے مجتہد اور عالم حدیث تھے، جرح و تعدیل کے فن سے پوری طرح واقف تھے اور اصول حدیث پر بہت اچھی نظر رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی جات میں کچھ مخصوص اصطلاحات کا

- ۹۔ اگر حدیث میں کوئی نامانوس یا مشکل لفظ آجاتا ہے تو اس کی تشریح کرتے ہیں۔
- ۱۰۔ کبھی کبھی کسی طویل حدیث کا اختصار کر دیتے ہیں اور فی الحدیث قصہ طویل لکھ دیتے ہیں۔
- ۱۱۔ اگر کبھی دو حدیثوں میں تضاد ہو تو وجہ و تاویل بیان کرتے ہیں۔
- ۱۲۔ فقہی حدیثوں میں فقہاء کے مذاہب ان کے دلائل اور اختلافات پر اپنی رائے بھی دیتے ہیں۔ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس حدیث سے کس امام نے کس مسئلے کا استنباط کیا ہے اور اس میں کیا اختلاف ہے۔ اس سے ائمہ کے اختلافات اور ان کی رائے کا پتا چلتا ہے، اس خصوصیت کی وجہ سے ترمذی سے فقہی مسائل میں استفادہ بہت آسان ہو گیا ہے۔

مندرجہ بالا خصوصیات نے ترمذی کی علمی، فقہی اور انشادی حیثیت کو بہت اونچا کر دیا ہے۔ مختلف مذاہب، ان کے درجہ استدلال اور اقسام حدیث کی تفصیل کسی دوسرے مجرے میں اتنی عمدگی سے پیش نہیں کیے گئے ہیں۔ شیخ ابراہیم بن محمد شافعی کا کہنا ہے کہ امام ترمذی کی جات تمام حدیثی اور فقہی فوائد اور سلف و خلف کے مذاہب کی جات سے مجتہد کے لیے کافی اور مقلد کو دوسری کتابوں سے بے نیاز کرنے والی ہے۔

عارضۃ الاحوذی محمد بن عبد اللہ شمیمی (۵۴۶ھ) کی، المتع الشذی  
ابو الفتح محمد بن محمد ثنی (۴۳۴ھ) کی، قوت المفتدی جلال الدین  
سیوطی (۹۱۱ھ) کی، اور ابن حجر عسقلانی (۸۵۲ھ) کی شریحیں  
مشہور ہیں۔

ہندستان کے علماء میں شیخ محمد طہر گجراتی (۹۸۶ھ) شیخ  
سراج احمد سرہندی (۱۲۳۱ھ)، محمد بن عبد الہادی سندھی (۱۱۳۸ھ)  
ابوطیب سندھی (۱۱۰۹ھ)، مولانا عبدالرحمان مبارک پوری (۱۳۵۳ھ)  
نے تحفۃ الاحوذی لکھی، الکوکب الدری رشید احمد گلگڑی (۱۳۲۳ھ)  
کے افادات ہیں جنہیں مولانا عبد یحییٰ کاندھلوی نے مرتب کیا اور مولانا  
محمد زکریا نے اپنے حواشی کے ساتھ شائع کیا۔ مولانا نور شاہ کشمیری  
کے افادات العروۃ الشذی کے نام سے مرتب ہوئے۔ ان کے علاوہ  
بھی بعض لوگوں نے مختلف قسم کے کام کیے ہیں۔

آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ امام ترمذی کی شمائل کا  
تذکرہ بھی کر دیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور  
اعمال مسلمانوں کے لیے واجب العمل ہیں اور آپ کا اخلاق رہن سہن  
برائے، اچھے بیٹھے کے طریقے اسوۂ حسنہ میں داخل ہیں۔ یوں تو  
آپ کی زندگی کے تمام پہلو احادیث کی کتابوں میں موجود ہیں لیکن  
امام ترمذی پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس ضرورت کو محسوس کیا کہ خاص  
اس موضوع پر ایک کتاب مرتب ہونا چاہیے اس خیال کے پیش نظر  
انہوں نے آنصوۃ صلیہ مبارک، برائے سامان، رہن سہن،  
عادات و اطوار، رفتار و گفتار، انداز نشست و برخاست، اخلاق

استعمال کیا ہے جو خود ان کی جدت ہیں مثلاً:  
۱۔ فلاں ذاہب الحدیث، اس سے مراد ہے کہ فلاں شخص کو حدیث  
یاد نہیں رہی۔  
۲۔ فلاں مقارہب الحدیث، اس کا مطلب ہے کہ فلاں شخص کی حدیث  
دوسرے راوی کی حدیث کے قریب ہے۔  
۳۔ ثبیح یس بذاک، یعنی یہ شخص پڑھا ہے اس کی روایت  
مقبول ہے۔  
۴۔ ہذا حدیث جیدہ سے مراد وہ حدیث ہے جو حدیث صحیح اور حدیث  
حسن کے بیچ کی ہو۔  
اسی طرح سے اور بھی بعض اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ فقہی  
مسائل میں کہیں کہیں پر اہل الرائے اور بعض اہل الکونہ کے الفاظ کا  
استعمال کیے ہیں جن سے مراد امام ابو حنیفہ ہیں۔

امام ترمذی کی جامع کو قبول عام حاصل ہوا، اور عام طور سے اس  
کی صحت کو لوگوں نے تسلیم کیا، جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ  
اس کا شمار صحاح ستہ میں ہوتا ہے اور بعض لوگ اس کو بخاری  
و مسلم کے بعد کا درجہ دیتے ہیں۔ بہت سے شعراء نے اس کی تالیف  
میں قصائد کہے جن میں سے کچھ کے اشعار شاہ عبدالعزیز صاحب نے  
بستان المحدثین میں نقل کیے ہیں۔ اس کی افادیت اور اہمیت کے  
پیش نظر بہت سے علماء نے اس کی شریحیں اور حواشی لکھے جن میں

اور محوالات زندگی سے متعلق جتنی روایتیں ان کو مل سکیں جمع کر دیں۔  
اس طرح یہ شمائل رسول اکرم صلعم کی جتنی جاگتی زندگی کی تصویر  
پیش کرتی ہے۔ یہ انداز لوگوں کو بہت پسند آیا اور بعد میں اس  
قسم کی اور کتابیں بھی مرتب ہوئیں، لیکن امام ترمذی کو اس میدان  
میں اولیت کے ساتھ ساتھ شرف قبول بھی حاصل رہا۔ بعض لوگوں  
نے اس کی شرحیں بھی لکھیں۔

## امام نسائی

(ولادت ۲۱۵ھ۔ وفات ۳۰۳ھ)

ابو عبد الرحمن احمد بن حنبل کی پیدائش خراسان کے شہر نسا میں  
ہوئی، اسی وجہ سے نسائی مشہور ہوئے، ان کا سنہ پیدائش کچھ لوگوں  
نے ۲۱۵ھ اور کچھ نے ۲۱۵ھ لکھا ہے، عام طور پر مؤرخ المذکور سنہ  
ہی کو صحیح مانا جاتا ہے۔ ان کا وطن نسا خراسان کے مشہور شہروں  
میں شمار ہوتا تھا۔ بہت سے علماء و فضلاء یہاں پیدا ہوئے، ان کے  
بچپن کے تفصیلی حالات کا ٹھیک سے پتا نہیں چلتا۔ زمانے کے دستور  
کے مطابق حصول علم کے لیے حجاز، عراق، شام، مصر وغیرہ شہروں کے  
اساتذہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، مستقل سکونت مصر میں اختیار کر لی  
تھی، ان کے اساتذہ کی فہرست خاصی طویل ہے جن میں قتیبہ بن سعید

اللہ تعالیٰ نے ان کو دولت سے نوازا تھا اور وہ اسے خرچ بھی اسی نیا صی سے کرتے تھے۔ ان کا دسترخوان دسین ہوتا تھا جس پر طرح طرح کے لذیذ کھانے ہوتے تھے۔ ضرورت مندوں کی مدد کرتے تھے، مسلمان قیدیوں کو فدیہ دے کر کھڑا کرتے تھے۔ اہل بیت اور حضرت علی سے ان کو بہت محبت تھی۔ عمر کے آخری حصے میں مصر سے دمشق گئے، ان وقت وہاں کے لوگ امیر معاویہ کی فضیلت اور شان کے قصیدے پڑھتے تھے اور حضرت علی کے لیے نامناسب جملے استعمال کرتے تھے۔ انھوں نے حضرت علی کی خوبوں کو نمایاں کرنے کے لیے ان کے مناقب پر مشتمل کتاب خصائص علی تصنیف کی اور اسے دمشق کی جامع مسجد میں لوگوں کے سامنے پڑھا۔ چونکہ یہ کتاب وہاں کے لوگوں کی عام رائے کے خلاف تھی اس لیے تھوڑا ہی عرصہ سننے کے بعد لوگ جوڑ گئے اور ان سے امیر معاویہ کے فضائل اور بدترکی بیان کرنے پر زور دینے لگے، انھوں نے اس سے انکار کیا، اس پر سب خفا ہو گئے اور ان کو بڑی طرح آزار پہنچنے لگے، غالباً یہی چوٹیں ان کی موت کا سبب بنیں۔

مندرجہ بالا واقعے سے بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ امام صاحب شیعیت کی طرف مائل تھے، لیکن امام صاحب کی تقریروں سے یا معاصرین سے اس قسم کی کوئی روایت نہیں ملتی ہے، علامہ ذہبی اور ابن حجر عسقلانی وغیرہ نے بھی ایسی کوئی بات نہیں لکھی ہے بلکہ اس کے برعکس اس کا بتنا چلتا ہے کہ انھوں نے فضائل صحابہ سے متعلق ایک

اسحاق بن راہویہ، محمود بن غیلان، حسین بن منصور، عیسیٰ بن حماد، محمد بن بشیر، محمد بن نصر مروزی، امام بخاری اور امام ابو داؤد وغیرہ شامل ہیں۔

ان کے گزردول کا سلسلہ بھی بہت وسیع ہے، اس زمانے میں جن علماء کی شہرت ہو جاتی تھی دور کے شہروں کے لوگ کسب علم کے لیے آنے لگتے تھے، ان کی شہرت سن کر بھی بہت سے لوگ ان سے کسب فیض کے لیے آئے۔ ان میں ابو بکر احمد بن محمد بن اسحاق، حسن بن شیعہ، ابراہیم بن محمد صالح، ابراہیم بن محمد طرانی، محمد بن معاویہ، محمد بن قاسم اندلسی، ابو جعفر طوسی، ابو عوانہ اور آپ کے صاحبزادے عبدالحکیم وغیرہ مشہور ہیں۔

امام مالک بڑے عابد و زاہد تھے، ان کی زندگی پاکیزہ تھی۔ اللہ کا خوف دل پر طاری رہتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ آخرت کی فکر سے پریشان رہتے، سنت کی پوری طرح سے پیروی کرتے تھے اور دین میں بدعت کی روک تھام کی کوشش کرتے تھے۔ عام طور سے ایک دن کے ناشے سے روزہ رکھتے، مزاج میں استغناء تھا اسی لیے امیر بن اور حاکموں کی مجلس سے پرہیز کرتے تھے۔ غزم و استغناء، صبر و ضبط اور تحمل مزاج میں رچ بس گئے تھے۔ شجاعت و بہادری کی مثالیں بھی ان کی زندگی میں ملتی ہیں، جہاد کا بھی جذبہ تھا، ایک مرتبہ امیر مصر کے ساتھ جہاد میں شریک بھی ہوئے۔



امام مسلم پر بھی ترجیح دی ہے۔ علامہ ذہبی نے لکھا ہے کہ امام نسائی حدیث، علل حدیث اور اسماء الرجال کے علوم میں مسلم ترمذی اور ابو داؤد سے زیادہ ماہر تھے۔ ابن خلکان نے ان کو اپنے زمانے کا امام حدیث قرار دیا ہے، ابوسعید عبد الرحمن نے تاریخ مصر میں ان کو امام حدیث، ثقہ، معتبر اور حافظ کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔ امام دارقطنی ان کو اپنے زمانے کے تمام محدثین سے اعلا تسلیم کرتے ہیں، ابوعلی نیشاپوری ان کو لاثانی امام حدیث کہتے ہیں۔ علامہ ذہبی نے بہت سے بزرگوں کے اقوال ان کی تعریف و توصیف میں نقل کیے ہیں۔

امام صاحب کے فقہی مذہب کے بارے میں کچھ لوگوں نے بحثیں کی ہیں، بعض لوگوں نے ان کو شافعی قرار دیا ہے، جن میں علامہ ساج الدین سیکی، شاہ عبدالعزیز اور نواب عبدالحق حسن خاں شامل ہیں۔ علامہ انور شاہ کشمیری نے ان کو حنبلی لکھا ہے۔ کچھ لوگوں نے ان کی سنن کی بعض ایسی روایات سے جو حنبلی مذہب کے مطابق ہیں، ان کو حنبلی ثابت کیا ہے، لیکن تذکرۃ المتحدین کے مصنف کا خیال زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ: ”وہ کسی خاص فقہی مسلک کے پابند نہ تھے بلکہ وہ خود فقیہ و مجتہد تھے اور جزئیات مسائل میں محدثین کی طرح ظواہر احادیث کے مطابق عمل کرتے تھے اور جن ائمہ کے مسلک کو کتاب و سنت کے زیادہ قریب پاتے تھے اسی کی تائید

کتاب لکھی۔ اس کے علاوہ حضرت ابوبکر و حضرت عمر کی روایتوں سے استدلال کیا ہے۔ انھوں نے اپنی سنن میں حضرت عمر کی وہ تقریر نقل کی ہے جو انھوں نے سیف بنی ساعدہ میں کی تھی اور جس میں کہا تھا کہ تم نہیں جانتے کہ حضور مسلم نے حضرت ابوبکر کو نماز پڑھانے کا حکم دیا تھا، پھر تم میں سے کون ابوبکر سے مقدم ہونا چاہتا ہے یا بعض جگہوں پر حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان کے بعض فیصلوں کو اپنی رائے کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔ ان باتوں سے پتا چلتا ہے کہ وہ اہل سنت و الجماعت کے مسلک پر یقین رکھتے تھے۔ محمد بن موسیٰ مامونی کہتے ہیں کہ کچھ لوگ حضرت علی کے فضائل لکھنے اور فضائل شیخین نہ لکھنے کی وجہ سے ابوعبدالرحمن نسائی کو ناپسند کرتے ہیں۔ میں نے ان سے اس مسئلے پر گفتگو کی تو انھوں نے جواب دیا جب میں دمشق گیا تو وہاں کے اکثر لوگ حضرت علی سے منحرف تھے تو میں نے ان کو گراں گوارہ راست پر لانے کے خیال سے کتاب انھما لکھی۔ مامونی کہتے ہیں کہ بعد میں انھوں نے فضائل صحابہ بھی تصنیف کیے۔

بہر حال امام نسائی کو متفقہ طور پر ائمہ حدیث کی صف اول میں شمار کیا جاتا ہے۔ بڑے بڑے علماء اور خود ان کے معاصرین نے ان کے علم حدیث کا اقرار کیا ہے۔ ابن جریر عسکری نے لکھا ہے کہ ”امام نسائی نقد رجال میں انتہائی محتاط، معتد اور اپنے تمام معاصرین پر مقدم تھے۔ فن رجال میں ماہرین کی ایک جماعت نے امام نسائی کو

فرماتے تھے۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے امام نسائی جس دور میں پیدا ہوئے اس میں حدیث اور اس سے متعلقہ علوم سے لوگوں کو بے حد دل چسپی تھی۔ تمام بڑے بڑے شہروں میں علماء و محدثین حدیث کی تحقیق و تنقید اور علوم حدیث کی تدوین میں مصروف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ امام نسائی کو بھی اس فن سے خاصی دل چسپی پیدا ہوئی، اور اپنی پوری توجہ سے اس علم کی تکمیل میں لگ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو غیر معمولی قوتِ حافظہ سے نوازا تھا اس لیے ان کو اس علم میں جلد ہی ایک نمایاں مقام حاصل ہو گیا اور اپنے دور کے علماء میں ممتاز ہو گئے۔ ان کے حافظے کا بہت سے لوگوں نے اعتراف کیا ہے، امام صاحب فنی رجال کے بھی ماہر تھے، ان کا شمار حدیث کے اہم نقادوں میں ہوتا ہے۔ ان کی شرائط روایت کو بعض لوگوں نے غامض و مسلم سے بھی زیادہ سخت قرار دیا ہے۔ حدیث کے کھرے کھرے کی پہچان میں ان کو ملکہ حاصل تھا۔ وارطقی اور حاکم نے لکھا ہے کہ ”وہ اپنے معاصرین میں صحیح و تقیم روایات و آثار اور رجال کی معرفت و تیز میں سب سے زیادہ واقف کار تھے تو علم حدیث کے ساتھ ساتھ امام نسائی کو دوسرے درجہ علوم و فنون میں بھی خاصا کمال حاصل تھا، خاص طور سے قرأت و تفسیر میں ان کو بہت مہارت تھی، فقہی مسائل کے استنباط میں بھی ماہر تھے۔ علامہ ذہبی نے ان کو ”افق

مشایخ مصر“ قرار دیا ہے۔

امام صاحب کی بہت سی تصانیف کا ذکر ملتا ہے ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں: سنن کبریٰ، المجتبیٰ (سنن صغریٰ) کے نام سے مشہور ہے، خصائص علی، مسند علی، مسند مالک، فضائل الصحابة، اسرار الرواة و التیض، بیہم کتاب الضعفاء، کتاب الجرح و التعديل وغیرہ۔ امام صاحب نے جب جامع دمشق میں اپنی کتاب خصائص علی کا کچھ حصہ سنایا تھا تو لوگ بہت خفا ہوئے تھے اور آپ کو مارا تھا، ان کو گھرایا گیا تو آپ نے فرمایا مجھے مکر لے چلو تاکہ وہیں یا اس کے راستے میں میرا انتقال ہو، موزنین کا اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ آپ نے مکہ پہنچ کر وفات پائی اور صفادمرہ کے بیچ میں دفن ہوئے اور بعض کا خیال ہے کہ رمل میں انتقال ہوا۔ یہ واقعہ ۳۰۲ھ کا ہے۔ امام صاحب کی تمام تصانیف میں ان کی سنن کو ایک خاص درجہ حاصل ہے، انھوں نے پہلے حدیث کی ایک بہت بھوسا کتاب لکھی تھی جس کو سنن کبریٰ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، اس کو مکمل کرنے کے بعد انھوں نے اسے اسیر رمل کے سامنے پیش کیا۔ انھوں نے پوچھا کہ کیا اس میں بیان کی گئی تمام احادیث صحیح ہیں۔ امام صاحب نے جواب دیا نہیں اس میں صحیح اور حسن دونوں قسم کی احادیث موجود ہیں۔ امیر نے کہا کہ آپ اس میں سے میرے لیے وہ حدیثیں منتخب کریں جو باطل صحیح ہوں۔ امام صاحب نے امیر کی فرمائش پر صحیح حدیثیں منتخب کر دیں

ہے، امام ترمذی کی طرح سے حدیثوں پر فنی نقطہ نظر سے بحث کی ہے اور امام ابو داؤد کے انداز پر احکام والی احادیث کی تدریس کی طرف خاص توجہ رکھی ہے۔ کہیں کہیں پر مشکل الفاظ کے معنی بھی بیان کر دیتے ہیں، حدیث کی سند یا متن میں کوئی شبہ ہوتا ہے تو اسے بیان کرتے ہیں۔ کسی موضوع پر پہلے صحیح حدیث پیش کرتے ہیں، اگر صحیح حدیث نہ مل سکے تو پھر کم درجے کی حدیث پیش کرتے ہیں مگر ساتھ ساتھ اس کے ضعف کو بیان کر دیتے ہیں، اگرچہ انھوں نے اپنی شرائط بہت سخت رکھی تھیں، جن کو دیکھ کر محدثین کی ایک جماعت نے ان کی شرائط کو بخاری و مسلم کی شرائط سے بھی سخت قرار دیا تھا، مگر ان کی اس کتاب میں صحیح حدیثوں کے ساتھ ساتھ کمتر درجے کی اور کمزور حدیثیں بھی اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ اس کی روایات تین قسم کی ہیں:

(۱) وہ روایات جو بخاری اور مسلم میں ہیں۔

(۲) وہ روایات جو بخاری اور مسلم کی شرائط کے مطابق ہیں۔

(۳) وہ روایات جن کو خود امام نسائی نے پیش کیا ہے اور اگر ان میں کوئی علت تھی تو اسے بیان کیا ہے۔

سنن نسائی کی شروح و حواشی صحاح ستہ کی دوسری کتابوں کے مقابلے میں کم لکھی گئی ہیں، اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس میں زیادہ تر وہی حدیثیں ہیں جو دوسری کتب صحاح میں آچکی تھیں اور ان کی تشریح و توضیح متعدد بار ہو چکی تھی۔ پھر بھی کچھ لوگوں نے توجہ کی اور شرحیں لکھی ہیں جن میں سے چند یہ ہیں:

اس انتخاب کا نام انھوں نے المبتقی رکھا جس کے معنی چنی ہوئی یا منتخب چیز کے ہیں۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ المبتقی تھا جس کے معنی پکے ہوئے پھل چنے کے ہیں۔ آج کل کہہ رہی انتخاب سنن صغریٰ یا سنن نسائی کے نام سے مشہور ہوا اور صحاح ستہ میں شمار کیا گیا ہے۔

بعض لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے کہ یہ تصنیف امام صاحب کی نہیں بلکہ ان کے شاگرد ابن السنی نے اس کا اختصار کیا ہے، حالانکہ یہ شاگرد امیر مدینہ کے مندرجہ بالا قلعے کے بعد درست نہیں معلوم ہوتی، مولانا عبدالرشید نعمانی نے حافظ زہبی کے حوالے سے حاشیے پر اس واقعے کو غلط لکھا ہے۔ امام صاحب سے ان کی سنن کو ان کے متعدد شاگردوں نے روایت کیا ہے۔ ابن السنی بھی ان میں سے ایک ہیں، ان کے علاوہ امام صاحب کے صاحبزادے عبدالکرم، البرہن علی بن احمد، طحاوی محمد بن مجاہد، بن الاثر و غیرہ ہیں۔ اس کی صحت کے بارے میں بہت سے علماء و مشائخ نے گواہی دی ہے اور صحاح ستہ میں شامل کیا ہے۔

امام صاحب نے اپنی سنن میں اپنے اسلاف کی کتابوں کے انداز بیان کی پیروی کی ہے، ایک ہی حدیث کو الگ الگ ابواب میں بیان کر کے اس سے مختلف مسائل نکالے ہیں، یہ انداز خاص طور سے انھوں نے امام بخاری سے لیا ہے۔ امام مسلم جس طرح ایک حدیث کے مختلف سلسلوں کو اختلاف الفاظ کے ساتھ ایک جگہ روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے بھی، وہی طریقہ اپنی سنن میں اختیار کیا

## امام ابن ماجہ

ولادت ۲۴۹ھ وفات ۲۴۳ھ

ان کا نام محمد کنیت ابو عبد اللہ اور لقب ابن ماجہ ہے۔ قزوین میں آپ کی پیدائش ہوئی اس لیے قزوینی بھی کہے جاتے ہیں۔ سلسلہ نسب یوں بیان کیا جاتا ہے۔ ابو عبد اللہ محمد بن یزید بن عبد اللہ۔ لفظ ماجہ کے بارے میں خاصا اختلاف ہے، کچھ لوگوں نے اسے آپ کی والدہ کا نام اور کچھ نے دادا کا نام بتایا ہے، لیکن بعد میں تحقیق کرنے والوں نے گھسا ہے کہ یہ آپ کے والد کا لقب تھا، شاہ عبد العزیز نے ماجہ کی نسبت ان کی ماں کی طرف کی ہے لیکن حوالہ نافعہ میں لکھتے ہیں:

”ماجمہ ان کے والد کا لقب ہے دادا کا نہیں اور

۱۔ الامحان فی شرح سنن النسائی: اس کے مصنف علامہ عبد اللہ (۵۶۷ھ) ہیں، غالباً یہ سنن نسائی کی پہلی شرح تھی بہت تفصیل انداز پر کی گئی ہے۔ بہت سے مباحث پر روشنی ڈالی گئی ہے۔  
۲۔ شرح ابن الملقن: اس کے مصنف عمر بن علی بن محمد (۸۰۴ھ) ہیں، انھوں نے سنن نسائی کی ان احادیث کی شرح کی ہے جو بخاری، مسلم، ترمذی اور ابو داؤد میں نہیں ہیں۔

۳۔ زہر الربی علی المجتبیٰ: اس کے مصنف علامہ جلال الدین سیوطی (۹۱۱ھ) ہیں۔ یہ شرح بہت مشہور ہے اور سنن نسائی کے حاشیے پر شائع ہوئی ہے۔

۴۔ ایک اور حاشیہ محمد بن عبد الہادی سندھی (۱۱۸۲ھ) کا ہے، یہ سیوطی کے حاشیے سے زیادہ مفصل ہے اور اس میں متن کے مشکل مقامات کا حل، مشکل الفاظ کی شرح اور اعراب وغیرہ کی تحقیق کی گئی ہے۔

اس کے علاوہ بھی ہندستان کے بعض علماء نے کچھ شرحیں اور حواشی لکھے ہیں جن میں مولانا محمد زکریا کا کام خاص طور سے قابل ذکر ہے۔

غالباً باغی بزرگوں سے اپنے ابتدائی دور میں امام صاحب بھی مستفید ہوئے ہوں گے اور پھر زمانے کے دستور کے مطابق تحصیل علم اور تحصیل فن کے لیے دوسرے شہروں اور ملکوں کے سفر کیے ہوں گے۔ بعض لوگوں نے ان کے شیوخ کی تعداد تین سو سے زائد بھی ہے ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں: محمد بن ابی خالد، ابو بکر قزوینی، ہارون بن موسیٰ بن جہان تمیمی، عمرو بن رافع، ابو جعفر بکلی، ابو بکر بن ابی شیبہ، جبارہ بن مفلس، سہل بن اسحاق، حمدون بن عمارہ، عبداللہ بن معاویہ، محمد بن سعید، ہشام بن عمار وغیرہ۔

امام صاحب مختلف شہروں سے کسب فیض کے بعد اپنے وطن قزوین واپس ہو گئے تھے اور وہیں درس و تدریس اور علم حدیث کی نشر و اشاعت میں زندگی گزار دی۔ جس طرح سے ان کے اساتذہ و شیوخ کی فہرست طویل ہے اسی طرح سے ان کے شاگردوں کی تعداد بھی بہت ہے ان میں سے چند کے نام یہ ہیں: ابراہیم بن دینار، احمد بن ابراہیم قزوینی، اسحاق بن محمد قزوینی، ابو بکر حامد ابهری، ابوالحسن بن قطان، سلیمان یزید، ابو جعفر محمد بن عیسیٰ وغیرہ۔ امام صاحب کی وفات چوتھ ۲۴۱ سال کی عمر میں ۲۴۳ھ میں ہوئی۔

امام صاحب کا دور حدیث کی تدوین و تردید کا دور تھا۔ اسی لیے قدرتی طور پر ان کو بھی اس فن سے دل چسپی ہوئی اور بہت جلد اس فن کے اکابر میں شمار کیے گئے۔ ان کی حالات شان و وسعت نظر ثقاہت اور حفظ حدیث کے بہت سے علماء معترن ہیں۔ حافظ ابویعلیٰ فیصلی فرماتے ہیں کہ وہ ایک بلند پایہ مقبر اور لایق جت و جت

ان کا نام بھی نہیں ہے..... اور اس کے متعلق بہت سی غلطیاں ہوئی ہیں۔<sup>۱</sup>

ماجرہ "ماہ" یا "ماہجہ" کا معرب ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام ابن ماجہ بھی اُنسل ہیں لیکن ان کے عرب کے مشہور قبیلے ربیعہ سے گہرے دوستانہ مراسم تھے جس کی وجہ سے "ربعی" بھی کہے جاتے ہیں۔ اس زمانے کا دستور تھا کہ جب کوئی شخص اسلام قبول کرتا تو جس قبیلے کے کسی شخص سے دوستانہ تعلقات پیدا کرتا اس قبیلے کی طرف منسوب ہو جاتا۔ چونکہ عام تاریخوں میں ان کے سلسلہ نسب میں صرف والد کا ذکر آتا ہے اس لیے خیال کیا جاتا ہے کہ ان کے والد نے ربیعہ قبیلے کے کسی فرد سے بیانِ وفا باندھا ہوگا۔ اسی لیے ربعی مشہور ہوئے۔<sup>۲</sup>

ان کے بچپن کا زمانہ علم و فن کے دور دورہ کا تھا عباسی خلافت اپنے عروج پر تھی۔ بڑے بڑے اہل علم اور باکمال دربار کی سرپرستی میں علوم و فنون کو آگے بڑھا رہے تھے۔ امام صاحب کی زندگی کے زیادہ تر حالات کا پتا نہیں چلتا لیکن لوگوں نے قیاس سے لکھا ہے کہ زمانے کے دستور کے مطابق بچپن ہی سے تعلیم کی ابتدا کی ہوگی، ابتدائی تعلیم کے بعد حدیث سے دل چسپی ہونے کے سبب ادھر توجہ کی ہوگی۔ تاریخوں سے پتا چلتا ہے کہ اس زمانے میں قزوین میں کئی اہم محدثین موجود تھے اور ان کی مجالس درس میں لوگ بھرت شریک ہوتے تھے۔

۱۔ بستان المحدثین، ص ۲۰۰ میں تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ابن ماجہ اور علم حدیث، ص ۱۸۵

۲۔ تاریخ امام صاحب کو تاریخ سے بہت دل چسپی تھی، یہ تاریخ کا نام بعض لوگوں نے "تاریخ کامل" اور بعض نے "تاریخ طبع" لکھا ہے۔ اس کا ایک نسخہ قزوین میں حافظ ابن طاہر مقدسی نے دیکھا تھا، اس میں صحابہ کے دور سے لے کر مصنف کے زمانے تک کی تاریخ اور خاص طور سے روایان حدیث کے حالات ہیں۔ چونکہ قدس کے لیے تاریخ رجال سے پوری واقف ضروری تھی غالباً ابن ماجہ نے اسی ضرورت کو ملحوظ رکھ کر اس تاریخ کو مرتب کیا تھا۔ افسوس ہے کہ تفسیر کی طرح یہ تاریخ بھی نہیں ملتی ہے۔

۳۔ سنن یہ امام ابن ماجہ کی سب سے اہم اور مشہور تصنیف ہے اور اس کی وجہ سے ان کی شہرت دعوت اور اہمیت میں بہت اضافہ ہوا۔ حدیث کی مشہور چھ کتابوں میں اس کو آخری نمبر پر شمار کیا جاتا ہے۔ بہت سے مدارس میں اسے دسی کتابوں میں شامل رکھا گیا ہے۔ اس کتاب کے بارے میں امام ابو زرہ فرماتے ہیں میں سمجھتا ہوں کہ اگر یہ کتاب لوگوں کے ہاتھوں میں آگئی تو حدیث کی موجودہ تصنیفات یا ان میں سے اکثر معطل ہو کر رہ جائیں گی۔ تاریخ قزوین میں ابوالقاسم امام الدین عبدالمکرم لکھتے ہیں حافظ حدیث امام ماجہ کی کتاب کو صحیحین، سنن ابی داؤد اور سنن نسائی کے برابر رکھتے ہیں اور اس کی روایات سے حجت کرتے ہیں۔ حافظ ابن کثیر کہتے ہیں:

"یہ کتاب امام ابن ماجہ کے علم و تبحر، اطلاع اور اصول

تھے ان کی عظمت و ثقاہت برافقان ہے، ان کو فن حدیث سے پوری واقفیت تھی اور وہ اس کے جلیل القدر حافظ تھے۔ ابوالقاسم رافعی نے لکھا ہے کہ ائمہ مسلمین میں ابن ماجہ بھی ایک بڑے مقیم امام ہیں ان کی قبولیت پر سب کا اتفاق ہے۔ علامہ ابن جوزی کہتے ہیں کہ وہ حدیث و تاریخ اور تفسیر کے ممتاز ماہر تھے۔ علامہ ابن خلکان نے بیان کیا ہے کہ وہ فن حدیث کے امام اور اس کے تعلقات پر بڑا عبور رکھتے تھے۔ حافظ ذہبی نے لکھا ہے کہ ابن ماجہ عظیم الشان حافظ و ضابط صادق القول اور وسیع العلم تھے۔ علامہ ابن اثیر فرماتے ہیں کہ وہ ذی عقل صاحب علم اور امام حدیث تھے، جمال الدین ابوالحسن بردی کہتے ہیں کہ ابن ماجہ امام، حافظ، حجت اور فاضل حدیث تھے۔ ان کو متعدد نفل میں مہارت حاصل تھی، علامہ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں کہ وہ صاحب سنن، حافظ حدیث اور امام فن تھے۔ امام ابن ماجہ کی تین اہم اور مشہور تصانیف ہیں:

۱۔ تفسیر اس تفسیر کے متعلق حافظ عماد الدین ابن کثیر نے لکھا ہے کہ "ابن ماجہ کی ایک جامع و ضخیم تفسیر ہے۔" اس میں امام صاحب نے تفسیری احادیث و اقوال صحابہ و تابعین سند کے ساتھ جمع کیے ہیں۔ علامہ سیوطی نے اس تفسیر کا تذکرہ کیا ہے۔ اب اس کا چتا نہیں چلتا۔

لے ملاحظہ فرمائیں امام ابوہریرہ اور علم حدیث ۱۲۵/۱۲۶ و تذکرۃ المحدثین ص ۲۸۸/۲۸۹

۱۲۶/۱۲۷ امام ابوہریرہ اور علم حدیث

فقہی اعتبار سے نہایت عمدہ ہے۔" اختصار اور عدم تکرار کے باوجود اس کی جامعیت مسلم ہے، اس میں معلومات اور مسائل دوسری کتابوں سے زیادہ ہیں۔ علامہ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ "ابن ماجہ کی کتاب سنن و احکام کی حیثیت سے بہت عمدہ اور جامع ہے۔ اس کی ایک بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں پانچ خلائی روایتیں ہیں۔ ابن ماجہ کی سنن کو صحیح بخاری کے سوا تمام دوسری کتب صحاح پر اس خصوصیت میں فوقیت حاصل ہے۔ بخاری میں ایسی باتیں (۲۲) روایات ہیں۔ ابن ماجہ میں پانچ (۵) ابو داؤد اور ترمذی میں ایک ایک ہے۔ مسلم اور نائی میں ایک بھی نہیں ہے۔

بعض لوگوں نے ابن ماجہ کی سنن کے بجائے امام مالک کی مؤطا کو کتب صحاح میں شامل کیا ہے اور بعض نے دارمی (متوفی ۲۵۵ھ) کی سنن کو، لیکن جہور کی نظر میں صحاح ستہ میں شمولیت کی سعادت صرف ابن ماجہ کی سنن کو مل سکی اور علامہ دھمشقین کی ایک بہت بڑی تعداد نے ہمیشہ اسے کتب صحاح ستہ میں شامل رکھا ہے۔ البتہ یہ بات درست ہے کہ اس میں بہت سی ضعیف روایات موجود ہیں، بعد کے محدثین نے ان کی کمزوریوں کی طرف اشارے کیے ہیں اور

لے بحوالہ تذکرۃ المدحین، ج ۱، ص ۲۴۰

۱۔ ایسی حدیثیں جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک طرف تین واسطے ہوں۔  
۲۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تذکرۃ المدحین، ج ۱، ص ۲۴۰ تا ۲۴۸ اور ابن ماجہ اور  
علم حدیث، ص ۲۳۸ تا ۲۴۲

فروع میں ان کی اتباع سنت کو بتاتی ہے۔" لے  
اس کی بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں بہت سی ایسی احادیث بیان کی گئی ہیں جو صحاح ستہ کی دوسری کتابوں میں نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ اس کی ترتیب کی بھی علماء نے تحقیر کی ہے، اس کی ابھی دو دوں خوبوں کی وجہ سے علماء نے اس کا شمار صحاح ستہ میں کیا ہے۔ تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ سب سے پہلے سنن ابن ماجہ کو حافظ ابو الفضل محمد بن طاہر مقدسی (۵۰۴ھ) نے صحاح ستہ میں شامل کیا۔ اگرچہ سنن ابن ماجہ کو آخری درجے پر رکھا گیا ہے لیکن اس میں بعض ایسی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو دوسری کتب صحاح میں نہیں ہیں۔ مثلاً اس میں بہت سی احادیث دوسری کتابوں کے مقابلے میں زیادہ ہیں۔ بحسن ترتیب کے ساتھ ساتھ اس کی تجویب بھی حدیث کی دوسری کتابوں کے مقابلے میں بہتر سمجھی جاتی ہے، اس میں حدیثوں کو ابواب کے اندر بلا تکرار اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب نے لکھا ہے کہ:

"ترتیب کی خوبی اور بغیر کسی تکرار کے احادیث کا لے آنا اور اختصار جو یہ کتاب رکھتی ہے، کوئی کتاب نہیں رکھتی۔" لے

حافظ ابن اثیر فرماتے ہیں کہ "اس مفید ترین کتاب کی تجویب

لے بحوالہ ابن ماجہ اور علم حدیث، ص ۲۳۸ لے بحوالہ ابن ماجہ اور علم حدیث، ص ۲۳۳  
لے بستان المدحین، ص ۱۲

تھے، بڑے عابد و زاہد تھے، تاریخوں میں لکھا ہے کہ تیس سال تک اہل اللہ رہے، انظار میں صرت روئی اور نمک استعمال کرتے تھے۔ حدیثوں کی تلاش و جستجو میں بڑی دور دور کے سفر کیے اور بڑی تعداد میں حدیثیں جمع کیں، بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ ایک لاکھ حدیثیں خطا تھیں۔ عمر کے آخری حصے میں بصارت سے محروم ہو گئے تھے، کہا کرتے تھے کہ یہ مجھے کثرت کلام کی سزا ملی ہے۔ ان کی ولادت ۲۵۴ھ میں اور وفات ۳۴۵ھ میں ہوئی۔

سنن ابن ماجہ پر بڑے بڑے اہل علم اور فن حدیث کے ماہرین ارفاظ نے شروح و حواشی لکھے، ان کی تعداد سنن نسائی کے شروح و حواشی سے زیادہ ہے ان میں سے چند قابل ذکر درج ذیل ہیں:

۱۔ شرح سنن ابن ماجہ: یہ سب سے پہلی شرح ہے جو حافظ علاء الدین مغلطی (۷۶۲ھ) بہت ہی جامع انداز پر لکھی جارہی تھی مگر مکمل نہ ہو سکی۔ اس کی شرح و بسط کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ اس کے ایک حصے کی شرح پانچ جلدوں میں ہے، اس کا فلسفی نسخہ ٹونک کے کتب خانے میں تھا۔

۲۔ شرح سنن ابن ماجہ: ابن حب زہیری، یہ کتاب ذرخیش ابوالحسن سندى نے اپنے حواشی میں کیا ہے۔

۳۔ التمس الیہ الحاجۃ علی سنن ابن ماجہ: شیخ سراج الدین عمر بن علی بن

راویوں پر بحث کر کے ان کے ضعف کو بیان کیا ہے، لیکن اس سے اس کتاب کی اہمیت میں کوئی کمی نہیں ہوئی، اس لیے کہ جس طرح سے امام بخاری، امام مسلم اور دوسرے بزرگوں نے سخت و جانفشانی سے اپنی کتابوں کو مدون و مرتب کیا تھا۔ انھوں نے بھی اسی انداز پر اور ویسی ہی محنت و شاقہ سے حدیثوں کی جمع و تدوین کی اور جس طرح سے مندرجہ بالا بزرگوں کی کتابوں میں کمزور درجے کی روایات شامل ہو گئی ہیں اسی طرح سے اس میں بھی ہوا، فرق صرف اتنا ہے کہ اس میں دوسری کتابوں کے مقابلے میں ایسی روایات کی تعداد زیادہ ہو گئی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کو کتب صحاح میں آخری درجے پر رکھا گیا ہے۔

سنن ابن ماجہ میں ایک ہزار پانچ سو (۱۵۰۰) ابواب ہیں اور اس میں چار ہزار حدیثیں بیان کی گئی ہیں۔ امام صاحب سے ان کی سنن کو ان کے متعدد شاگردوں نے روایت کیا ہے ان میں سے چار زیادہ مشہور ہیں:

(۱) ابوالحسن بن قطان (۲) سلیمان بن یزید۔

(۳) ابو جعفر محمد بن عیسیٰ (۴) ابو جبر حامد ابہری۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے سعد بن ابی حمزہ بن دینار کے ناموں کا اس فہرست میں اور اضافہ کیا ہے بلکہ ان سب میں ابوالحسن قطان کی روایت کو قبول عام حاصل ہوا۔ یہ خود بہت بڑے عالم اور حافظ حدیث



## کتابیات

۱۸۔ ترجمہ: بستان المؤمنین

۱۹۔ بشیر القاری

۲۰۔ مقدمہ معارف مشکوٰۃ

۲۱۔ نصرت الحدیث

۲۲۔ فن اسرار الرجال

۲۳۔ انوار حدیث

۲۴۔ آثار و معارف

۲۵۔ خطبات مدراس

۲۶۔ حجۃ اللہ البالغۃ

۲۷۔ انتخاب الترغیب والترہیب

۲۸۔ تذکرۃ الحفاظ

۲۹۔ تہذیب التہذیب

۳۰۔ مقدمہ شرح مسلم

۳۱۔ توجیہ النظر

۳۲۔ تاریخ بغداد

۳۳۔ طلیۃ الاولیاء

۳۴۔ اختصار علوم الحدیث

۳۵۔ مؤلفہ علوم الحدیث

شاد عبد العزیز دہلوی

علامہ شبلی نعمانی

سید سلیمان ندوی

سید مناظر احسن گیلانی

مولانا ضیاء الدین اصلاقی

غلام رسول سعیدی

نقی الدین ندوی

مولوی محمد علی

شاہ محمد عزالدین بھٹاروی

مترجم: سید عبداللہ جلانی

مفتی عزیز الرحمن بجنوری

محمد فاروق خان

محمد علی صدیقی کاندھلوی

عبد الرشید نعمانی

مولانا عبد اسلام قدوائی ندوی

نائب حسین نقوی

محمد فاروق خان

۱۔ بستان المؤمنین

۲۔ سیرۃ النعمان

۳۔ حیات مالک

۴۔ تدوین حدیث

۵۔ تذکرۃ المؤمنین

۶۔ تذکرۃ المؤمنین

۷۔ محدثین عظام اور

ان کے علمی کارنامے

۸۔ مقام حدیث

۹۔ علوم الحدیث

۱۰۔ ترجمہ تحریر بخاری

۱۱۔ امام عظیم البوصیف

۱۲۔ حدیث کا تحارف

۱۳۔ امام عظیم اردعظم الحدیث

۱۴۔ ابن ماجہ اور علم حدیث

۱۵۔ حدیث نبوی کے اولین تصنیف

۱۶۔ امام احمد بن حنبل

۱۷۔ کلام نبوت

عبد

سید غلام جیلانی

مولانا سید عبدالرؤف

مولانا حبیب الرحمن اعظمی

تقی الدین ندوی

سید محمد ہاشم شمس

قاضی الطہر مبارکپوری

علامہ سید سلیمان ندوی

شاہ ولی اللہ

(اردو ترجمہ: مولانا عبد الرحیم)

ذکی الدین مندوی

(اردو ترجمہ: مولوی محمد عبد الباقی)

حافظ عبد اللہ شمس الدین دہلوی

ابن جریر عسقلانی

یحییٰ بن شرف النہوی

طاہر بن صلاح البرزازی الدمشقی

ابوبکر خطیب بغدادی

حافظ ابو نعیم احمد بن عبد اللہ

ابن کثیر

حاکم نیشاپوری

علامہ سیوطی	۳۰
ابن عمرو بن علقمہ	۳۱
ابن عبد البر	۳۲
ابن الاثیر	۳۳
ابن حجر عسقلانی	۳۴
ابن حجر عسقلانی	۳۵
ابن سعد الواعظی	۳۶
امام بخاری	۳۷
علامہ ذہبی	۳۸
علامہ ذہبی	۳۹
حاتم رزوی	۴۰
علامہ سیوطی	۴۱
محمد ابو زہرہ	۴۲
مصطفیٰ سیاحی	۴۳
شیخ جمال الدین قاسمی	۴۴
احمد محمد رشک	۴۵
ابن حجر	۴۶
السفادی	۴۷
مولانا عبد السلام قندلانی	۴۸
الرازی	۴۹
علوم الویش	۵۰
الإستیعاب	۵۱
اسد الخاب	۵۲
سان ایزان	۵۳
الاصحاح	۵۴
حقیقہ	۵۵
تاریخ بکیر	۵۶
میزان الزکریا	۵۷
تاریخ الاسلام	۵۸
تاریخ التمدین	۵۹
مقاتل الخفا	۶۰
ابن جبل	۶۱
المستدرک للحنفی	۶۲
ترویج التوحید	۶۳
السباعث النفیث	۶۴
شرح اقتدار علوم الحدیث	۶۵
شرح تخیمة الفکر	۶۶
فتح النفیث	۶۷
مسلمان اور ملت کے تقاضے	۶۸